

میں نے مسکرا کر اس زندگی بھری لڑکی کی خوشی کو سراہا۔
 ”میں نہیں جانتا یہ تمام لا جک (Logic) یہ تمام دلائل میرے پاس کہاں سے یک

کیا وجہ ہے کہ فزکس میں کوانٹم تھیوری کو تو حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ لیکن روشنی کے اس

دم ہی آگئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی کوئی خاص مذہبی انسان نہیں رہا۔ اور میں نے پہلے سے اس تقریر کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔“

”میں جانتی ہوں۔ سب مقررین کو موقع پر ہی تقریر کے عنوان دیے گئے تھے۔ بہر حال، تم نے میدان مار لیا۔ چلو اسی بات پر تمہیں کیفے میرا سے بہترین کافی پلواتی ہوں۔“

خدا اور محبت

مجھے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرتے تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ میرے ہاتھوں کو چونکہ ایسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے پہلی رات ہی ان پر چھالے پڑ گئے تھے۔ جو اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غفور امیرا جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا وہ رکھ رہا تھا۔ ویسے بھی میں دوسرے مزدوروں سے کچھ الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے غم تھے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ان سب میں ان کی دانست میں زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے غفور نے میرا نام ”بابو“ رکھ چھوڑا تھا۔

میری راتیں پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم کے کسی بیچ پر گزرتی تھیں۔ اور دن سارا مزدوری کرتے ہوئے۔ مجھے ان دنوں میں اس بات کا احساس شدت سے ہوا کہ ہم انسانوں نے اس زندگی کو ایک خواہ مخواہ کا بکھیڑا بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ انسان چاہے تو اس کا گزارہ دو جوڑے کپڑے میں بھی بہت خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

میں حماد اور امجد رضا، جس کے کپڑے لندن کے بڑے بڑے بوتیک سے تیار ہو کر آتے تھے۔ جو کف لنکس اور ٹائی کی پن میچنگ نہ ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا سوٹ اٹھا کر باہر پھینک دیتا تھا اور جس نے کبھی کسی تقریب میں ایک دفعہ کا پہنا ہوا لباس دوبارہ نہیں پہنا تھا۔ وہ حماد اب بڑے آرام سے اپنے ایک جوڑا پیٹ شرٹ اور ایک وردی میں گزارا کر رہا تھا۔ ریلوے کے دھوبی گھاٹ سے پانچ روپے میں جوڑا دھل کر آ جاتا تھا اور وردی تو ویسے بھی سرکاری طور پر ہر دوسرے روز دھل کر آ جاتی تھی۔

کبھی میری جیسے کانٹی نینٹل، انگلش یا عربی ناشتے کے لوازمات کے بغیر مکمل بھی نہ ہوتی تھیں۔ فرانس کا بنا ہوا کارن فلیکس اور مصر کا درآ مد شہد نہ ہوتا تو میں ناشتہ ہی ادھورا چھوڑ کر اٹھ جاتا تھا۔ اب پلیٹ فارم کے کیبن کی تیز پتی کی چائے اور بند مکھن کے ساتھ بڑے

ربیکا کی عادت تھی کہ وہ بات کہہ کر جواب نہ بغیر آگے چل دیتی تھی۔ سو میں بھی ایک لمبی سی سانس بھر کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ اس سے بحث کرنے یا منع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا جتنا کافی کا ایک مگ حلق سے نیچے اتارنے میں لگتا ہے۔

بظاہر یونیورسٹی کا ماحول پُر سکون تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس دن کی، کی ہوئی تقریر آگے چل کر چند ہفتوں میں کن نت نئے اور بڑے طوفانوں کو جنم دینے والی ہے۔

بقول کامران ”میں یہودی نظروں میں آچکا تھا لیکن بے خبر تھا۔“

خوب سے خوب تر کی ریس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاید دنیا میں اگر ہر آدمی اکیلا ہی ہوتا تو اسے زندگی اتنی کٹھن اور مشکل کبھی نہ لگتی۔ میاں، بیوی، بچے، بچوں کے بچے۔۔۔۔۔ یہ سب رشتے ہیں۔ انسان کو اس دلدل میں دھکیل دیتے ہوں شاید؟

ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا اور آج جمعرات کا دن تھا۔ آج میری شام کو چھٹی تھی۔ میں غفورے کو بتا کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ یہ پورا ہفتہ میں نے باہر کی دنیا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔ اسٹیشن سے ایک ٹانگے والے کو میں نے مولوی علیم کے پرانے محلے چلنے کو کہا۔ ہم زندگی میں روزانہ کئی فیصلے کرتے ہیں کہ کل یہ کرنا ہے، اگلے ہفتے وہاں جانا ہے۔ فلانی تاریخ کو فلاں کام کرنا ہے لیکن ان میں سے بہت کم فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تکمیل کا وقت قریب آتے ہی آپ کا دل ڈوبنا شروع کر دے۔

بس یہی حالت اس وقت میری بھی مولوی صاحب کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ شاید اب میں ان سے کی گئی زیادتی کی معافی مانگنے کے قابل نہ سہی۔۔۔۔۔ پر طلب گار تو ہو سکتا تھا۔

ٹانگے نے مجھے پرانے محلے کے گیٹ پر اتار دیا۔ یہ عصر کا وقت تھا، یہی کوئی شام پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ میں دھڑکتے دل اور بھاری قدموں سے مولوی صاحب کی گلی کے کٹڑ تک آ پہنچا۔ لیکن اب آگے بڑھنے کی ہمت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ مولوی صاحب کا دوبارہ سامنا کرنے کی وجہ سے اور کچھ اس نازنین کے گھر کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے خیال سے ہی جیسے میرے پسینے سے چھوٹ رہے تھے لا

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ مولوی صاحب کی گلی میں تین چار ہی گھر تھے اور اس وقت گلی تقریباً سنان ہی پڑی تھی۔ بہت دیر تک میں مولوی صاحب کے مکان کے کٹڑی کے دروازے کے قریب کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اندر سے دور کسی کے بولنے کی مدہم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل پھر سے اچھلا۔ شاید یہ ایمان کی ہی آواز ہو۔ میں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر کسی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

مزرے کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔
فریش اسٹرابری شیک کی جگہ گمنے کے رس نے لے لی تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے لُنج اور ڈنر کی جگہ پلیٹ فارم کے ہوٹل کے تنور کی سادہ روٹی اور شوربے نے لے لی تھی، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شروع کے دو تین دن کے علاوہ بعد میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ واقعی ہم انسانوں نے خود اپنی زندگیوں کو مفت کے جھیلوں میں الجھایا ہوا تھا۔ خاص طور پر ہم امیر لوگ، ہماری خود پرستی اور خود پسندی! اک عذاب ہی تو ہے۔

مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آتی گئی کہ انسان کی زندگی میں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو اگر زندگی بتانے کا ایک پیمانہ سمجھا جائے تو ان چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ تر لوگ دوبارہ گھنٹے دن اور رات کی نیند میں ہی بتا دیتے ہیں۔ باقی بچے بارہ گھنٹے تو اس میں سے بھی چھ گھنٹے تو دنیا داری کی فکر، دفتر اور نوکریوں یا کاروبار وغیرہ کے جھیلے میں گزر جاتے ہیں۔ باقی چھ گھنٹوں میں بھی آپ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے کا دورانیہ شامل کر لیں تو زندگی کے بمشکل دو یا تین گھنٹے ہی گزرتے ہیں جو ہم یا کوئی بھی انسان اپنے لیے بتاتا ہے۔ اب ان دو تین گھنٹوں کی زندگی کے لیے اس قدر جدوجہد، اس قدر بے ایمانی، اس قدر کھینچا تانی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان اگر معیار کے مقابلے میں پڑنا چاہے تو پھر معیار اور اعلیٰ زندگی کی بھلا کیا حد ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک تعیش بھری زندگی کی مثالیں ہمارے سامنے آ جائیں گی۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کے پاس ہوتے بس چوبیس گھنٹے ہی ہیں۔ سارا کھیل انہی چوبیس گھنٹوں کو ٹالنے کا ہے۔ چاہے بہترین سے بہترین ملنے کی بے چینی میں کاٹ لیں، یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پر صبر اور شکر کر کے بتا دیں دن بھر شکوہ کرتے رہیں یا پھر سجدہ شکر میں بسر کر دیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تو بہر حال گزر رہی جاتے ہیں۔

زندگی روز مجھے نئے نئے سبق سکھا رہی تھی۔ یا شاید میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا تھا۔ شاید مجھے اس لیے بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اکیلا تھا۔ شاید رشتے ہی انسان کی سب سے بڑی مجبوری بن جاتے ہیں۔ رشتوں کے تقاضے انسان کو ناشکری اور

آنکھیں چندھیا جانے کے بعد ٹھیک ہونے کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ کچھ دیر میں حیا دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہلے اس نے کھلا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا اور پھر دروازے کی تھوڑی سی کھلی جھری سے ہی اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کے جواب کے بعد اس سے کہا کہ میں مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حیا نے مجھے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے اس لیے آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ میں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس چند لمحوں کے لیے۔۔۔۔۔ پلیز۔“

جواب میں حیا تو پُپ ہی رہی لیکن ایمان جو نہ جانے کب دروازے پر حیا کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی، اس کی آواز اُبھری۔

”دیکھیں آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔ ابا جان کی حالت بڑی مشکل سے کچھ سنبھلی ہے۔ وہ آپ کو یہاں دیکھیں گے تو۔۔۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔۔۔۔ آپ یہاں دوبارہ نہ آئیے گا۔“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کے عین بیچ میں کوئی بڑا سا جھرا گھونپ دیا ہو۔ کسی نے بھاری پتھر سے اُسے کچل دیا ہو۔ لیکن اس میں ان بے چاریوں کا بھی بھلا کیا قصور تھا؟۔۔۔۔۔ اپنے شریف باپ کی صحت کے لیے کوئی بھی بیٹی کچھ ایسی ہی ترکیب تجویز کرتی۔ چند لمحوں کے لیے مجھ سے جیسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر میں نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ورنہ میں کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ جو کچھ بھی ہوا میری وجہ سے ہوا۔ تو ازالہ بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ مجھ سے ان سے معافی مانگنے کا موقع مت چھینئے۔۔۔۔۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔“

ایمان کی آواز فضا میں پھر سے گنگنائی۔

”اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وقت خود ہی اپنے آپ ان کے زخم بھر دے گا۔ لیکن آپ یوں بار بار اگر ان کے سامنے آتے رہیں گے تو شاید وہ اس بات کو کبھی

”جی کون ہے۔۔۔۔۔؟“

یہ ایمان ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز کا جلت رنگ میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لیے اس لمحے زمین اور آسمان کی گردش جیسے تھم سی گئی تھی۔ جواب میں میں نے جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے غوں غاں کی کیسی عجیب سی آواز نکلی کہ اسے دوبارہ میرا نام پوچھنا پڑا۔ اتنی دیر میں ایمان دروازے کے بالکل قریب پہنچ کی تھی مولوی صاحب کے تمام ملنے والوں کو شاید کسی کے گھر کے باہر دستک دینے کے تمام آداب کا سخت لحاظ ہوتا ہوگا اور ایمان شاید مجھے بھی انہی مہذب لوگوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہی تھی جو دستک دے کر دس قدم دور جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اندر سے اگر کوئی نسوانی آواز سنائی دے تو باقاعدہ منہ ہی پھیر لیتے ہیں تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ لیکن بھلا مجھ جیسے جاہل کو ان روایتی آداب کا کیا پتہ تھا۔ میں نے تو اس طرح سے کسی کے دروازے پر دستک بھی زندگی میں پہلی بار دی تھی۔ میرے تو تمام دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں کے اُدھے اُدھے محل نما مکانات تھے۔ جن کے کیوں پر بیٹھے دربان ہارن بجنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیتے تھے۔ اور میری اسپورٹس کار زن سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔

شاید ایمان یہی سمجھی کہ میں مولوی صاحب کا کوئی ایسا ہی تہذیب یافتہ مہمان ہوں جو دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد نسوانی آواز سن کر دروازے سے اتنی دور جا کھڑا ہوا ہے کہ اس کی آواز بھی اندر اس تک ٹھیک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازے کو تھوڑا سا کھول کر پوچھنے کے لیے ایک جھری سی بنائی۔ میں گم سم سا ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی نازک اور مخروطی انگلیاں دروازے کے سرے پر نظر آئیں اور پھر ایمان نے دوپٹے کا نقاب اوڑھے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی دروازے کے اتنے پاس ہی کھڑا ہوگا۔ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی اور میری اور اس کی نظر ایک لحظے کے لیے ٹکرائی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہر نی جیسی آنکھوں میں وہی شدید حیرت لہرائی جو بس اس کی آنکھوں کا خاصہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہٹا، کچھ کہے تیزی سے وہاں پلٹ گئی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا۔ میں بھی ابھی تک اس کی نظر کی بجلی سے جیسے

صورت گزر رہے۔۔۔۔۔ یہ بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پھانسی کا کوئی قیدی ہوں اور تختے پر کھڑا دوسری طرف کے مقتول کے ورتاء کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا مجھے معاف کر دیا جائے گا یا پھر لیور کھینچ کر پھانسی دے دی جائے گی۔

صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ پھر کھلا اور عبداللہ برآمد ہوا۔ میں نے اُمید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

”آئیے۔۔۔۔۔ اندر آ جائیے۔“

میری رُک جی ہوئی سانس پھر سے جیسے بحال ہو گئی۔ میری جان میں جان سی آ گئی اور میں عبداللہ کے پیچھے سر جھکائے پھر سے اس گھر میں داخل ہو گیا جہاں وہ رہتی تھی۔ ہم صحن سے ہوتے ہوئے اسی بیٹھک کی طرف بڑھ گئے جو لکڑی کی جالیوں سے پار برآمدے سے ملحق تھی۔ عبداللہ مجھے بٹھا کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے ایک سناٹا سا طاری رہا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ ہر ترتیب ویسے ہی تھی جیسی میرے یہاں پہلی آمد کے وقت تھی، لیکن تب کے اور اس وقت کے میرے استقبال میں کس قدر فرق تھا۔ وقت کی بازی اچھے اچھوں کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر میں دروازے پر مولوی صاحب کے کھانسنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب چھڑی کے سہارے ٹپکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہ شکل سے برسوں کے بیمار معلوم ہو رہے تھے۔ میں ان کے استقبال کے لیے احراما کھڑا ہو گیا۔ وہ آ کر پُپ چاپ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے سلام کا انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

کچھ دیر ماحول پر گھمبیر سے خاموشی طاری رہی۔ میرے تو سارے لفظ جیسے پہلے ہی کھو گئے تھے، خود مولوی صاحب بھی گرم سم سے تھے، پھر میں نے ہی خاموشی توڑی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔“

”بھلا ہوں اب۔۔۔۔۔ شکر ہے مالک کا۔“

”کیا آج میں آپ سے معافی کی اُمید کر سکتا ہوں۔“

بھلا نہ پائیں۔ انہیں آپ سے اب کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ بھی اس بات کو بھول جائیں، جو ہو اسو ہوا، اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

ایمان کی دلیل اپنی جگہ درست تھی، لیکن میرے لیے یہ تب درست ہوتی کہ اگر میرا مقصد آخری بار مولوی صاحب سے معافی مانگ کر واپس چلے جانے کا ہی ہوتا۔ اس صورت میں میں تو سالوں انتظار کر سکتا تھا کہ جب مولوی صاحب کے دل کے داغ ہلکے پڑ جائیں گے تو سامنے آ کر معافی مانگ لوں گا۔

پر میرا مقصد تو اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مجھے ان سے پہلے ان کا اعتماد اور پھر ان کے گھر میں چھپا وہ گدڑی کا لعل جیتنا تھا جس کی ایک نظر نے میری دنیا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی اس طرف چپکی کھڑی میرے جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور میں اس طرف کھڑا اپنے ذہن میں کوئی نئی تاویل گھڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگر میں آج اس در سے پلٹ گیا تو شاید دوبارہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ پاؤں۔ میں نے آخری بار ہمت جمع کر کے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اندر برآمدے کی طرف سے مولوی صاحب کی آواز ابھری۔

”کون ہے بھئی دروازے پر وہاں۔۔۔۔۔؟“

اندر ایک طویل سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اتنے میں ایک اور بات عمل پذیر ہوئی۔ عبداللہ گلی کے کٹڑے سے تسبیح گھماتا گلی میں داخل ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھنک سا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں مولوی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

عبداللہ نے کچھ تامل کیا۔

”شاید ان سے آپ کا ملنا اس وقت کچھ بہتر نہ ہو۔“

”آپ ان سے اندر جا کر میرا تذکرہ تو کریں۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو

میں واپس چلا جاؤں گا۔“

عبداللہ چند لمحوں کے لیے سوچتا رہا۔ پھر سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ یہ چند لمحے مجھ پر کیا قیامت کی

www.Paksociety.com

والوں کی کہی ہوئی باتوں کا بوجھ ہٹ جائے تو تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آج کے بعد تمہیں مجھے اس گھر کے راستے کو، اس گھر کو اور اس میں بسنے والے سبھی لوگوں کو ان کی عزت اور وقار کی خاطر ہمیشہ کے لیے بھلانا ہوگا۔ میں نے تمہاری بات ٹھنڈے دل سے سن لی ہے اور تمہاری معذرت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمہیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم واقعی اپنے اور اپنے گھر والوں کے طرز عمل پر شرمندہ ہو۔ بولو دے سکتے ہو مجھے یہ وعدہ۔۔۔۔۔؟ پانا چاہتے ہو اپنا پرانا بھرم واپس؟“

مجھے لگا کہ میں لا جواب سا ہو گیا ہوں۔ ضرور شا کر نے اس ایک ہفتے میں مولوی صاحب سے دے لفظوں میں میری مرضی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ تبھی انہیں اپنی پیش بندی کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ گویا وہ جانتے تھے کہ وہ میرا مقصد اس معافی سے سوا بھی کچھ مزید ہے۔۔۔۔۔ کچھ اور ہے۔

میں نے اپنی ہمت پھر سے جمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ اُس دن آپ نے کہا تھا کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ میں جو بھی ہوں دوسروں کے بل بوتے پر اور اس گھر کی شان و شوکت کی وجہ سے ہوں۔ میں نے اگلے دن ہی وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب میں یہاں اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا اس گھر کی دولت اور شان و شوکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس وقت ایک معمولی مزدور ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ خود دو وقت کی ردی کما سکتا ہوں۔ ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں، دلوں سکتا ہوں۔ جو صرف اور صرف میری ذات کے بل بوتے پر ہوگی۔ اس میں میری ماضی کی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اور اپنی اسی نئی شناخت کے بل پر میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

مولوی صاحب کی تیوری پر غصے کے بل نمودار ہوئے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا۔

”کوئی بھی بات دہرانے سے پہلے اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ میرے کچھ بھرم ابھی باقی ہیں۔ کہیں تمہاری درخواست ان آگینیوں کو بھی پارہ پارہ نہ کر دے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ ناممکن ہے۔“

”جو بیت چکا اس کا بار بار ذکر کیوں کرتے ہو؟“ معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ معافی دینے والی صرف اس کی ذات ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ میاں۔ یہ بڑے لوگوں کے یاد رکھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔“

ان کا لہجہ آخر میں خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ یہ بھی انہی کا ظرف تھا کہ وہ میرے وجود کو اس وقت خاموشی سے اپنے ہی گھر میں برداشت کر رہے تھے، کوئی اور ہوتا تو شاید مجھے دھکے دے کر دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔

”جو کچھ میرے گھر والوں نے آپ سے کیا وہ ان کی کم ظرفی اور ناقابل تلافی گناہ ہے۔ لیکن آپ سب لوگوں سے خفا کیوں ہیں؟“

مولوی صاحب کے لہجے میں مزید تلخی ابھر آئی۔

”جانے دو میاں۔۔۔۔۔ یہ سب کھیل تماشا ہے بڑے لوگوں کا۔۔۔۔۔ اور تم جیسے امیر زادوں کے لیے روز کا کھیل، پرہم سفید پوشوں کی عمر بھر کی کمائی چند بھرم ہی تو ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہم جیسوں کے پاس ان کا وہ بھرم بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے۔“

”کیا میرا سب سے بڑا قصور آپ کی نظروں میں بس یہی ہے کہ میں ایک امیر زادہ ہوں۔۔۔۔۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیا کسی کا امیر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی نیت پر کوئی ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار ہی کھودے۔ تو پھر مجھے بتائیے کہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے مجھے کس امتحان کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ میں آپ کا اعتبار پانے کے لیے آگ کے کسی بھی دریا سے گزرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔۔۔۔ اور پھر آپ میری جس امارت سے خفا ہیں وہ تو خود میری اپنی بھی نہیں ہے۔ دوسروں کی عطا کردہ ہے۔ آپ نے تو خود کہا تھا اُس دن کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی دی ہوئی اس شناخت کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔“

میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا اور اپنی رو میں جانے کیا کچھ بول گیا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیسے میری باتوں پر غور کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

”تم اگر واقعی معافی کے طلب گار ہو اور چاہتے ہو کہ میرے دل سے تمہارے گھ

کے نوجوانوں کو پہلے یا بمشکل دوسرے کلمے کے بعد کے کلموں کا علم تک نہ ہوا۔ جہاں قرآن کو صرف سجا کر طاق میں رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا ہو۔ جہاں عورت مرد بے حجابانہ ملتے ہوں۔ تمھاری تربیت بھی تو ایک ایسے ہی گھر کی ہے۔ صرف گھر چھوڑ دینے سے انسان کا ضمیر نہیں بدل جاتا۔ میں اپنے آنے والی نسلوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اب اجازت دو۔“

مولوی صاحب غصے میں میری کوئی بات سننے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عبداللہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے جانے کا عذر کیا لیکن اس نے پھر بھی جلدی سے چائے کپ میں انڈیل دی تھی۔ میں نے دو گھونٹ زہر مار کیے۔ عبداللہ مجھے چھوڑنے باہر گلی تک آیا اور جاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

”چچا جان کی باتوں کا بُرا امت منائیے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں تھے۔ میں نے اسی لیے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ اب ان سے دوبارہ نہ ہی ملیں تو بہتر ہوگا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جائیے۔ شاکر چچا نے اس دن بتایا تھا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ ماں باپ کا بڑا مقام ہوتا ہے، ان سے اتنی ناراضگی اچھی نہیں مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ عبداللہ مجھے محلے سے باہر چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں تو ٹھیک طرح سے عبداللہ کو خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں پیدل ہی کس جانب روانہ ہوں۔ مولوی صاحب کے جملے میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ بہہ کر داخل ہو رہے تھے۔ کیا واقعی محبت بھی ایک گناہ ہے۔۔۔؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو پھر یہ کیسا گناہ ہے جو مجھے بے چینی کے بجائے خوشی اور سکون دے رہا تھا؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کے انکار کی وجہ صرف طبقاتی فرق ہوگا امیری غریبی کا فرق۔۔۔۔۔ لیکن یہاں تو جنگ مذہب اور محبت کے درمیان تھی۔ مذہب محبت کو دھتکار رہا تھا۔ میں اس وقت سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر میں پورے چھ کلمے یاد کر لیتا اور میں بھی مولوی صاحب جیسا شرعی لباس پہن کر اگر کسی مسجد کے متولی کی حیثیت سے ان کی بیٹی کا رشتہ لینے

نہیں جب مولوی صاحب کے گھر کے لیے اسٹیشن سے چلا تھا تو میں نے ایسا بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج ہی اس سلسلے میں حتمی بات کرنی پڑے گی۔ لیکن مولوی صاحب کے حتمی انداز سے خود بخود بات کو اس کا حتمی رخ دے دیا تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ پھر میں نے ہی یہ کفر توڑا۔

”میں نے سوچا تھا کہ کسی حتمی بات کے لیے کسی بزرگ کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔ میرے گھرانے کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ہیں جو میری التجا آپ تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے شاید پہلے ہی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ اپنی دولت اور امیری کی بدنامی کا طوق تو میں پہلے ہی اپنے گلے سے اتار چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی کوئی خامی ہے تو میں اُسے بھی دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے دھتکارنے کی کوئی وجہ تو بتا دیں۔“

مولوی صاحب کا ضبط اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے غصے میں چلائے اور کھڑے ہو گئے۔

”بس۔۔۔۔۔ بہت ہو گیا۔ کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرنے پر تائے ہوئے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مولوی علیم جس گھرانے میں بچے کو درس دینے جاتے تھے۔ اُسی گھرانے میں اپنی بیٹی بیاہ دی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا زمانہ ہم پر انگلیاں اٹھائے۔ جو الزام تمھارے گھر والوں نے مجھ پر اور میری بیٹیوں پر لگایا ہے، اُسے ہم اپنے ہاتھوں سے سچ کر دکھائیں۔ نہ میاں نہ۔۔۔۔۔ ہمارے حال پر کچھ تو رحم کرو۔“

”تو گویا آپ کو صرف لوگوں کی باتوں کا ڈر ہے۔ اگر میرے گھر والے اگر آپ سے بدتمیزی نہ کرتے اور میری خوشی کے لیے یہ رشتہ لے کر آ بھی جاتے تو آپ اُسے قبول نہ کرتے۔“

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔ ہمارا اور تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔ تمھاری تربیت کچھ اور ہے۔ تم جن اغویات کو پیارا اور محبت کا نام دیتے ہو ہمارے ہاں اُسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف گناہ، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں مجھے مزید گناہ گار منت کرو۔ ہماری بیٹیاں ایسے لادین گھرانوں میں نہیں بیاہی جاتیں جہاں سالوں سال کسی نے نماز تک نہ پڑھی ہو۔ جس گھر

جاتا تو میں کیوں ان کے لیے قابل قبول ہو جاتا۔۔۔؟

اگر میں مذہب سے دور تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ایمان کے لیے میری محبت تو اسی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔ اتنی ہی پاک تھی جتنی کسی مذہب کی شمولیت کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنی تربیت کی وجہ سے کچھ خاص اچھا مسلمان نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا میری محبت سے کیا تعلق تھا۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب ریلوے اسٹیشن آ پہنچا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور آخری میل بھی نکل چکی تھی۔ پلیٹ فارم میرے دل کی طرح ویران پڑا تھا۔ اکاؤنٹ کا کیبن ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ میں گم سم سا آ کر ایک خالی بیچ پر بیٹھ گیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری مذہب سے ان جانی دُوری آج مجھے اور میری محبت کو اس قدر حقیر بنا دے گی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ مولوی علیم کی باتوں نے مجھ سے پل میں مجھ سے میری ذات کا۔۔۔ میری محبت کا غرور چھین لیا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ تنہا شخص اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔

oo

محبت کے تین پہر

میری اس دن کی یونیورسٹی ہال میں کی گئی تقریر نے مجھے خاصا مقبول کر دیا تھا، کہتے ہیں متنازعہ ہونا بھی مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی ہوتا ہے۔ اب میں مقبول زیادہ تھا یا متنازعہ۔۔۔؟ اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

اگلے دن ہیو مینٹرنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو محبت پر بحث کرنے کی دعوت دی۔ ربیکا نے کہا محبت فائنا کی بوتل کی طرح ہوتی ہے، جب تک ختم نہ ہو جائے، پیتے جانا چاہیے۔ جم نے کہا کہ محبت جسم ہے جسے پائے بنا پیاس نہیں مٹ سکتی۔ ٹینا نے کہا محبت دارڈروب میں لٹکے کپڑوں کی طرح ہے۔ رڈز بدل کر پہننے کو دل کرتا ہے۔ سارہ نے کہا محبت اور کچھ نہیں، بس جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اور تبدیلی بھی وہ جو غیر مستقل ہوتی ہے۔ ہارمونز جیسے ہی واپس اپنی مستقل جگہ پر واپس آئے نہیں کہ محبت ختم۔

کسی من چلے نے پیچھے سے گرہ لگائی کہ لیکن جب تک محبت کے ہارمونز واپس اپنی جگہ لینے کے لیے آتے ہیں، تب تک ان دو پریمیوں کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بات پر ساری کلاس ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر سر آئزک میری طرف متوجہ ہوئے۔

”اور حماد تم۔۔۔ تمہارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”سر۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت بھی انسان پر کسی دن کے پہروں کی طرح وارد ہوتی

ہے۔“

”اور نیلی۔۔۔ کیا آپ کلاس کے سامنے محبت کے ان پہروں کو بیان کرنا پسند

کریں گے؟“

”محبت کا پہلا پہر ہمیشہ چمکھن، تشنگی اور شدید پیاس لے کر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے

جب آپ کا محبوب آپ سے دور ہوتا ہے۔ آپ کے جذبے آپ ہی تک محدود ہوتے ہیں

بعد انجام کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“

میں نے مسکرا کر جم کی طرف دیکھا۔

”انجام وہی ہوتا ہے جو کسی بھی بھرپور دن کا تینوں پہر گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی شام۔۔۔۔۔ تین پہروں کے بعد محبت کی بھی شام ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ خاموش۔۔۔۔۔ ٹھہری ہوئی اور ساکت سی اک خوبصورت شام۔۔۔۔۔ محبت کی شام۔“ میں خاموش ہو گیا۔ کلاس نے تالیاں بجا بجا کر اور ڈیسک پٹخ کر آسمان سر پر اٹھالیا اور ان میں سب سے سرفہرست ربیکا تھی۔ سارہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ میرے اور کلاس کے باقی طلباء کے درمیان جو ایک عجیب سی جھک تھی وہ ایک دم ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب آتے جاتے لڑکے لڑکیاں مجھے بھی اسی طرح چیخ چلا کر پوری گرجوشتی سے خوش آمدید اور الوداع کہتے تھے جیسے باقی سب آپس میں ویش (wish) کرتے تھے۔

کامران میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا، اُس نے تو باقاعدہ پوری ایک شام اس خوشی میں ہی منائی اور مجھے زبردستی سنٹرل انڈن کے ایک بہت بڑے سینما بھی لے کر گیا جس میں ایک ہی عمارت میں کئی ہال تھے۔ اور ہر حال میں الگ فلم لگی ہوئی تھی۔ کوئی عجیب سی کاؤ بوائے فلم تھی اور پھر اس پر دوسری مصیبت کامران کی پوری فلم میں مسلسل رواں کنٹری۔ وہ شاید پہلے بھی یہ فلم دس مرتبہ دیکھ چکا تھا لہذا اُسے مکالمے تک زبانی یاد تھے۔ وہ ہر منظر سے پہلے ہی مجھے اس کا پورا خلاصہ بتا دیتا تھا۔ تنگ آ کر جب میں نے اُسے سینما ہال سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ تب جا کر وہ بمشکل چپ ہوا لیکن تب تک فلم ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ جب اسکول کے دور میں ہم کلاس سے بھاگ کر کوئٹہ کے مشہور ریگل سینما میں صبح کا شہر دیکھنے جاتے تھے تب بھی ہال میں گھس کر پتہ چلتا کہ کامران صاحب پہلے بھی کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے یہ ٹارزن یا سند باد کے کارناموں سے بھرپور فلم دیکھ چکے ہیں اور آج مجھے اور ہمارے ساتھ بھاگنے والے دوسرے گینگ کو صرف بور کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب ہم نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ ہم اپنے ساتھ سفید رنگ کی بڑی کپڑے کی سرڈیکل ٹیپ کی ریل لے کر جاتے اور جہاں کامران کی ٹیپ نہیں شروع ہوتی ہم سب مل کر

اور یک طرفہ محبت کی یہ تڑپ آپ کو ہر لمحہ کانٹوں پر چلنے کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔۔ پھر اظہار ہو جاتا ہے اور خوش قسمتی سے اگر اظہار قبولیت کا شرف بھی پالے تو محبت کا دوسرا پہر شروع ہوتا ہے۔ تب محبت کی اصل ٹھنڈی چھاؤں کا اور ابدی سکون کا احساس ہوتا ہے، تب تپتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک ملتی ہے اور جلتا صحرا بھی نخلستان بن جاتا ہے۔ ایسا نخلستان جس کا ساکت رکا ہوا پانی بھی کسی میٹھے اور صاف بہتے جھرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔“

مجھے ربیکا کی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

”اور محبت کا تیسرا پہر۔۔۔۔۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ان دو پہروں کو جھیل کر محبت کے تیسرے اور آخری پہر تک پہنچ جاتے ہیں۔ محبت کے تیسرے پہر میں پہلے پہر سے بھی زیادہ شدید تشنگی، شدید تیز پیاس اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تشنگی، یہ پیاس پالینے کی پیاس ہوتی ہے۔“

سارہ کے منہ سے حیرت میں نکلا، وہ پوچھ کر ضرور پچھتائی ہوگی۔

”پالینے کی پیاس۔۔۔۔۔؟ یہ کیسی پیاس ہوتی ہے؟“

ہاں۔۔۔۔۔ پالینے کی پیاس۔۔۔۔۔ جب آب حیات کا دریا سامنے بہہ رہا ہو تو کون ہوگا جو صرف ایک آدھ گھونٹ پر اکتفا کرے گا؟۔۔۔۔۔ پالینے کی پیاس، جدائی کی پیاس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور اگر یہ پیاس لگ جائے تو ملن جدائی سے زیادہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہماری محدود زندگی کبھی ہمیں اس دریا سے پوری طرح سیراب نہیں ہونے دیتی۔ ہم ابھی چند گھونٹ ہی حلق سے اتار پاتے ہیں کہ جانے کا وقت آ جاتا ہے۔“

ساری کلاس پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جم کو شاید کلاس کی وہ محویت پسند نہیں آئی۔ وہ میری باتوں کا اثر زائل کرنے کی نیت سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔ اب یہ بھی بتاتے جاؤ کہ محبت کے تیسرے پہر سے گزرنے کے

میں نصب لوہے کے اس جھنگل کی طرف چلا آیا جس کے پار دُور تک گہرائی تھی اور یہیں سے دریائے ٹیمر پر بناوہ پل اور اس کے نیچے سے گزرتے اسٹیمر اور چھوٹے بحری جہاز اندھیرے میں چمکتے جگنوؤں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں دیر تک دُور بہتے پانی میں ان جھملاقی روشنیوں کا عکس دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ محسوس ہونے پر مڑا تو ربیکا محویت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں جب بھی تم سے ملتی ہوں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جسے میں پھر سے ایک نئے انسان سے مل رہی ہوں۔“

”ہر انسان کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں۔ پیاز کی طرح، اُسے جتنا چھیلو، اتنی ہی مرتبہ ایک نئی تہ ابھر آتی ہے۔ اب یہ چھیلنے والے پر منحصر ہے کہ وہ دوسرے کی کتنی کھوج کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ تمہاری کھوج اس عام کھوج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس دن جب تم کلاس میں محبت کے مختلف پہر بیان کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کو جانا ہے اور ایک مجھ پر ہی کیا منحصر ہے، اس دن کے بعد ساری کلاس ہی محبت کے ان نئے پہلوؤں کو کھوجنے میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے ہم سب کو محبت کا ایک نیا چہرہ دکھا دیا ہے۔“

”چہرہ نیا نہیں ہے، بس اس سے پہلے ذرا ادجھل تھا، محبت ایک نظریہ ہی تو ہے اور ہم سب اس نظریے کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔“

”سنو۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

پھر خود ہی اُس نے فوراً اپنے ہی سوال کو جھٹلا دیا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ یہ سوال تو تم سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ جو انسان محبت کو اتنا زیادہ پہچانتا ہو، وہ خود ضرور اس تجربے سے گزرا ہوگا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محبت کو کیسا پایا؟“

”محبت میرے لیے اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح ثابت ہوئی جس کے نیچے رکھا سر کٹ تو جاتا ہے لیکن پوری طرح دھڑ سے علیحدہ نہیں ہو پاتا۔ جسم تڑپتا رہتا ہے۔ جان

اُس کے منہ پر یہ چوڑی ٹیپ کا پورا رول لپیٹ دیتے۔۔۔۔۔

اُس رات بھی ہال سے نکل کر گھر جاتے ہوئے میں اور کامران بچپن کی ان حسین یادوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ سڑکوں پر سے برف ہٹانے والی مشین نے سڑکوں کے کناروں پر برف کے چھوٹے چھوٹے سے ڈھیر جمع کر دیے تھے، جن میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ بھیگی چمکیلی سڑک پر رات کی وجہ سے اکا دکا گاڑیاں بھاپ اڑاتی گزر رہی تھیں اور فٹ پاتھ پر لیٹ ٹائٹ شو سے نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے سے چپکے، سرگوشیاں کرتے اپنے گھر دلوں کو واپس جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک گاڑی نے ہمیں کر اس کیا اور پھر آگے جا کر رک گئی۔۔۔ پھر فوراً ہی ریورس میں ہماری طرف بڑھی اور قریب آ کر رک گئی۔۔۔ اندر سے ربیکا نے سر نکالا اور زور سے ہاتھ ہلا کر چلائی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ کتنا حسین اتفاق ہے، آؤ ہمیں جوائن کر لو۔“

ربیکا کے ساتھ گاڑی میں میرے دو اور کلاس فیلو بھی تھے جن میں سے ایک ربیکا کا کزن بھی تھا۔ یہ انکشاف بھی مجھ پر اسی رات ہوا تھا۔ میں نے ربیکا کا شکریہ ادا کیا کہ ہم آج پیدل مڑگشت کے موڈ میں ہیں۔ کامران نے جلدی سے گھور کر مجھے کہنی ماری۔ اس کی لغت میں کسی بھی خوبصورت لڑکی کی کوئی بھی پیش کش ٹھکرانے کا سوال ہی کب تھا۔ اوپر سے ربیکا کی ضد، ہم دونوں کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ربیکا کے کزن نے تھوڑی دُور جا کر سڑک کے کنارے بنے ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ کی پچھلی جانب سے کچھ دُور بہتے دریائے ٹیمر کے جگمگاتے پانیوں کا عکس اور سرسراہٹیں صاف سُنی جاسکتی تھیں۔ انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ کامران ربیکا کے کزن اور میرے دوسرے ہم جماعت کو ربیکا سمیت ہاتھ دیکھنے کے گھر اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دو لڑکوں کا ہاتھ وہ اس اُمید پر دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد آخر کار اُسے ربیکا کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ اس کا بہت پُرانا طریقہ واردات تھا، اور سچ ہے کہ وہ اس طریقے سے بہت مرتبہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں نہایت انہماک سے کامران کو اپنے اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ میں اُنھ کر سینٹ کے فرش کے آخری حصے

دھیرے دھیرے اور نکلتے نکلتے نکلتی ہے۔ خون کے چھینٹے مرتے مرتے بھی آس پاس کی دیواروں کو محبت کی نشانی کے طور پر رنگ جاتے ہیں۔
ریکا نے اذیت سے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

”اف۔۔۔ اتنی اذیت ناک محبت۔۔۔ میڈی۔۔۔ پھر تم اب تک زندہ کیسے ہو۔“

”محبت کی تو پھر اذیت کا ڈر کیسا مس رہی۔“

میں نے مسکرا کر ریکا کو اس نام سے پکارا جس سے تمام کلاس اسے پکارتی تھی۔ ریکا کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

”میں نے کہا تھا نا۔۔۔ تمہارا ہر روپ نیا ہے، جانتے ہو میں اپنے سارے پُرانے دوستوں اور سارہ کو ناراض کر کے تمہارے ساتھ ڈیسک پر کیوں آ بیٹھی تھی۔“
میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ جس دن بلیک بورڈ پر وہ بے ہودہ نعرے لکھے دیکھے تھے۔ تب میں بہت دیر پہلے سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ تم نے جس اطمینان سے ان کے چیلنج کو قبول کیا اور تمہاری آنکھوں میں جو ایک عزم تھا ایسا عزم صرف ان لوگوں کے چہرے پر دکھتا ہے جو دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتے ہوں اور مجھے بچپن سے ہی بہادر اور پُر عزم لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم مجھے پوری کلاس میں سب سے مختلف دکھائی دے۔ اس لیے میں نے تمہارے ساتھ ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہر گزرتا دن میرے اس فیصلے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔“

اتنے میں کامران جو بہت دیر سے ریکا کو میرے پاس کھڑے دیکھ کر دُور سے بُرے بُرے سے منہ بنا رہا تھا، اس کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے باقاعدہ آوازیں دے کر ہمیں بلانا شروع کر دیا۔ لگتا تھا ریکا مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمیں اپنی باتوں کا سلسلہ یہیں ختم کرنا پڑا اور ہم دونوں میز پر پڑی اپنی کافی کو مزید ٹھنڈا ہونے سے بچانے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئے۔

www.Paksociety.com

محبت اور خدا

اُس دن مولوی صاحب کی باتوں نے میرا اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے مجھے جس شناخت کی ضرورت تھی وہ میں نے حاصل کر لی ہے لیکن اس دن پتہ چلا کہ مجھ سے تو میری پچھلی شناخت بھی چھن گئی ہے۔

بیچ میں ایک آدھ بار شاکر سے پُرانی حویلی جا کر مل آتا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ گھر میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شاید میری غیر موجودگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ باغیوں کو جتنی جلدی لوگوں کے دل و دماغ سے پھینک نکالا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کی بغاوت کے جراثیم دوسروں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات بھلا کمشنر صاحب سے بہتر اور کون جان جاسکتا تھا۔ سو انہوں نے گھر میں میرا نام لینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ کمشنر صاحب کا خیال تھا کہ میں کامران کے پاس لندن جا چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا اور میرا کچھ اتنا پتہ نہیں تھا گھر والوں کو۔ کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا جہاں میں اتنا عرصہ کسی دوست کے گھر ان سے چھپ کر ٹھہر سکتا۔۔۔ شاید عباد کو بھی یہی سوچ کر سکون مل گیا ہو ورنہ وہ مجھے ہر جگہ تلاش تو کر ہی چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں بھی یہیں اسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پچھلے چار ہفتوں سے مزدوری کر رہا تھا۔

گھٹ سے بھی شاکر کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ پوچھ ہی نہیں پایا۔ جب میں شاکر سے رخصت ہو کر جانے لگا تب اُس نے اکیلے جاتے دیکھ کر مجھے پیچھے سے آواز دی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ گھٹ چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”یہ آپ نے کیا حالت بنالی ہے اپنی بھتیجا، اس محبت نے تو آپ کو برباد کر کے رکھ دیا“

اس کے ہونے کا احساس دلاتے رہے تھے۔ وہی دونوں موتی جو حویلی کی سٹڈی میں ایمان سے ملاقات والے دن اس کے جانے کے بعد ملے تھے۔ اب تک مجھے جب کبھی اپنی تنہائی میں سخت تھکاوٹ میں، دن بھر کی مشقت کے بعد ٹوٹے بدن کے ساتھ ویٹنگ روم کی کسی سخت آرام کرسی پر گر کر پڑے ہوئے، جب کبھی بھی میرا دل بہت اُداس ہوتا یا ایمان کی بہت یاد آتی تو میں ان دو موتیوں کو اپنی پلکیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا، پل بھر میں ان کی ٹھنڈک میرے بند پونوں سے ہوتی ہوئی میری رُوح کی گہرائیوں تک کو چھو لیتی۔ میرے تصور میں ایمان اُتر آئی، انہی جھکی جھکی، گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ، پھر وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رہتی اور میں گھنٹوں اس سے اپنے من کی باتیں کرتا رہتا۔ اور میری ساری رات انہی سپنوں میں گزر جاتی۔

یہ تھوڑا اور خواب بھی کیسی نعمت ہوتے ہیں۔ انسان سے اگر شاید تصورات اور خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جائے تو وہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ خواہشوں کی گھٹن اس کا گلابا دبا کر اُسے مار ڈالے گی۔ ہم اپنی نوے فیصد خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے ذریعے ہی تو پاتے ہیں۔

گھٹت نے حیرت سے ان دو موتیوں کو دیکھا، میں نے اُسے ان انمول گواہ کی پوری کہانی سنائی اور وہ دونوں موتی گھٹت کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

”یہ موتی اُسے واپس دے دینا۔ اور اُس سے کہنا کہ اگر میری تقدیر میں ہوا تو ایک دن وہ خود مجھے یہ موتی واپس لا کر دے گی۔ اب جنگ میری اور زمانے کی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب لڑائی تقدیر سے ہے۔۔۔۔۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔“

میں گھٹت کو بھگی آنکھوں کے ساتھ وہیں کھڑی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ زندگی میں ہم سب پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ جب ہم کسی سے ماننا، کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اس وقت ہمیں اپنی اس خاموش تنہائی کی اپنے آپ باتیں کرنا بھی نہیں بھاتا۔ بس ہمیں اک سکوت کی تلاش ہوتی ہے، جی چاہتا ہے ہم کچھ دیر کے لیے زمانے بھر گے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں کوئی ہم سے کچھ نہ پوچھے، کوئی بات نہ کرے۔

ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے بھیا۔ نہ میں آپ کو اس سے ملاتی نہ۔۔۔۔۔“ آنسوؤں سے لگی کی آواز رندھی گئی۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت اس کے سامنے رو پڑتا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے تھپتھپایا۔

”نگی ایک بات بتاؤں؟“

نگی چپ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”جی۔“

”تم آج بھی بچپن کی طرح روتے ہوئے بہت بڑی لگتی ہو۔“

چند لمحوں کے بعد حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر جب اُسے میری اس کو چپ کر دینے کی چال سمجھ میں آئی تو روتے روتے ہنس دی۔

نگی نے مجھے بتایا کہ وہ میرے مولوی صاحب سے ملنے کے بعد دو مرتبہ ایمان کے گھر جا چکی ہے۔ مولوی صاحب اب کافی بہتر ہیں۔ گھٹت نے اُسے میرے گھر چھوڑنے اور یوں در بدر بھٹکنے کی تمام داستان سنائی تھی۔ گھٹت کی باتیں سن کر ایمان تو چپ بیٹھی حسب معمول اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین پر بچھا قالین کریدتی رہی البتہ حیا سے صبر نہیں ہوا اور وہ رو پڑی تھی۔ ایمان نے گھٹت سے صرف اتنا کہا کہ اگر میں کبھی گھٹت سے ملوں تو وہ مجھ سے کہے کہ میں اپنی یہ ضد چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔

یہ تھا اتنی صدیوں کے بعد اس دلربا کا میرے لیے ایک پیغام صرف یہی چند لفظ۔۔۔۔۔

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔۔۔۔۔

لیکن یہ لفظ بھی میرے لیے بہت تھے، چلو کسی بہانے ہی سہی۔۔۔۔۔ میرا ذکر تو اس کے لبوں پر آیا، یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ گھٹت میرے ہاتھوں کے چھالے چھو چھو کر دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھیکتی رہیں۔ مجھے گھٹت کو بتانا پڑا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر قفل گیری کا دھندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ اس بات کے بارے میں اپنے یا میرے گھر والوں کو نہیں بتائے گی۔ شاکر نے کبھی میرا پیچھا کر کے میرا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب میں مناسب سمجھوں گا خود اُسے بتا دوں گا۔

میں نے اپنی جیب سے وہ دو موتی نکالے جو اب تک ایمان کی غیر موجودگی میں مجھے

”جی شکریہ۔ آپ چلے۔۔۔ میں بھی کچھ دیر میں حاضر ہو جاؤں گا، مسجد اس طرف ہے۔“

میں نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ بزرگ بھی سخت کایاں ہی نکلے۔۔۔۔۔
”میاں مسجد کا راستہ یوں نہیں دکھاتے، مسافر کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں پھر ضبط کر گیا۔
”افسوس۔۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلتا لیکن اس وقت میں اپنی کچھ اُلجھنوں میں پھنسا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ کسی اور کے ساتھ چلے جائیے، میں معذرت خواہ ہوں۔“
بزرگ نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر اس بیچ پرستالوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہے خطبہ شروع ہونے میں۔“
ایک بار تو جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ یہ پورا پلیٹ فارم خالی پڑا ہے۔ کہیں بھی جا کر سنانے کا شوق پورا کر لیجئے۔۔۔۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی میری طرح تنہائی کا مارا کوئی انسان ہوگا۔ دو گھڑی بیٹھ جائے گا تو میرا کیا جائے گا۔ میں اور میری تنہائی تو صدیوں کے ساتھی ہیں، اور ہمارا ساتھ تو ابد تک کا ہے، ہم دونوں پھر کبھی مل لیں گے۔
میں نے ایک طرف ہو کر تختے پر اس بزرگ کی بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ اپنے کاندھے پر پڑی چادر سے اپنا ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے۔

”میرا نام رحمت اللہ ہے، لاہور جا رہا ہوں۔ وہیں کارہنہ والا ہوں یہاں پر کچھ پریس اور کچھ پبلشنگ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اس لیے دو تین ماہ میں ہفتہ دس دن کے لیے آنا پڑتا ہے۔“

جواب میں انہوں نے میری طرف اس اُمید سے دیکھا کہ اب میں اپنا شجرۂ نسب ان کے سامنے بیان کروں، میں نے مختصر اُبتایا۔
”میرا نام حماد ہے۔ یہاں پر قلی ہوں۔“

اس دن گہت سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی شاید مجھے کا دن تھا۔ ابھی ابھی کوئٹہ ایکسپریس چھوٹی تھی اور اسٹیشن سے بھیڑ رفته رفته چھٹ رہی تھی۔
میں چپ چاپ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے شہوت کے گھنے سے درخت کے نیچے بچھے لکڑی کے بیچ پر بیٹھا ہوا اس کے پُرا نے تختے پر ویسٹرن ریلوے کے کھدے ہوئے الفاظ کو غور سے دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ہماری ارد گرد کی نصب ہوئی کئی چیزوں نے جانے کتنے مہدوسال دیکھ رکھے ہوتے ہیں، جانے کیسے کیسے زمانے ان پر سے دارد ہو کر گزر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اب اسی لکڑی کے بیچ کو بی لی لے لیں۔ تقریباً سو سال سے انگریز کے دور سے یہ اب تک یہی نصب تھا، جانے کتنی دھوپیں، جانے کتنے سائے، جانے کتنی بارشیں اور برف باریاں اور جانے کتنی آندھیاں سہی ہوں گی اُس تنہا بیچ نے۔۔۔۔ اور جب مجھ جیسے کئی اور کم ظرف انسان اس پر بیٹھ کر بڑی بڑی شیخیاں بگھارتے ہوں گے تو یہ سب چیزیں آپس میں اشارے کر کر کے ہم کمزور اور فانی انسانوں کا کتنا مذاق اڑاتی ہوں گی۔ سچ ہے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے پل کی بھی تو خبر نہیں اُسے اپنی۔۔۔۔ پھر یہ گھمنڈ کس بات کا۔۔۔۔

میں انہی خیالات کی یلغار لیے بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نورانی سے چہرے والے بزرگ جو شاید سامنے لگنے سے وضو کر کے آئے تھے، کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے، میرے متوجہ ہونے پر مسکرائے۔

”معاف کرنا میاں۔۔۔۔ تم شائد کسی گہری سوچ میں گم تھے، میں نے تمہیں چونکا دیا۔“

سچ تو یہی ہے کہ اس وقت مجھے ان کی یہ مداخلت بے حد ناگوار گزری تھی لیکن بہر حال ان کی عمر کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی تلخی ظاہر نہ کی جائے۔ ہم انسان بھی کیسی کیسی روایات کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں، کچھ سانس بھی اپنی مرضی کی مل نہیں پاتیں۔

”جی فرمائیے۔۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔“
بزرگ مسکرائے۔ ”ارے خدمت و دمت کچھ نہیں میاں۔ مجھے کا وقت ہے، سوچا آپ کو یاد دلا دوں کہ نماز کا وقت ہونے ہی والا ہے، ہو سکتا ہے آپ نے کچھ تیاری کرنی ہو۔“

دے گی۔ حاضری پوری ہی نہ ہوئی تو پیشی کا موقع ہی نہیں ملے گا اور پیشی اور سنوائی کا موقع ہی نہ ملا تو ہم تو گئے کام سے نا۔“

میں حیرت سے رحمت اللہ صاحب کی تقریر سنتا رہا۔ بہت بڑی بات انہوں نے بہت سہل زبان میں کہہ دی تھی۔ واقعی نالائق سے نالائق تر، کوڑھ مغز سے کوڑھ مغز ترین اور شریر سے شریر تر طالب علم کو بھی امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل ہی جاتا تھا بشرطیکہ اس کی حاضریاں امتحانی معیار کے مطابق پوری ہوں۔ اب پاس فیل ہونا اس کی قسمت اور اعمال پر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پرچے چیک کرنے والا رحم کھا کر 33 نمبر دے ہی دے۔ لیکن جس طالب علم کی حاضری ہی پوری نہ ہو اسے تو امتحان لیے بنا ہی فیل تصور کیا جاتا ہے۔

”ٹھیک کہا آپ نے۔ اس حساب سے تو حاضری بڑی ضروری ہوئی۔“ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

”نماز کی حاضری کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بڑا کٹھن ہوتا ہے پانچ وقت کی یہ روزانہ حاضری کاٹنا۔ شروع شروع میں تو میں بڑا تنگ ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو جائے نماز پر کھڑا تو کر لیتا لیکن یہاں نیت باندھی اور وہیں ایک تیزی اور دنیا بھر کی جلدی کی ایک ایسی بے چینی سر پر سوار ہو جاتی تھی کہ جسے اگر وہ نماز پڑھنے میں نہیں نے ذرا بھر مزید دیر لگا دی تو جانے کتنے لاکھ کا گھانا ہو جائے گا۔ اسی تیزی میں جلد از جلد الٹی سیدھی رکعتیں پڑھ کر بس سلام پھیرنے کی کرتا تھا۔ جانے پوری پڑھتا بھی تھا یا آدھی نامکمل پڑھ کر ہی ختم کر دیتا تھا۔ اور ادھر سلام پھیرا اور ادھر وہ تیزی وہ بے چینی ختم۔ لگتا تھا جیسے خون میں جو ابال آ رہا تھا وہ بس اس نماز کی وجہ سے ہی تھا۔ پھر چاہے گھنٹوں وہیں بیٹھا رہوں، کچھ نہ کروں تب بھی ویسی جلدی اور بے چینی پیدا نہ ہوتی، ہاں البتہ جیسے ہی دوسری نماز کے لیے کھڑا ہوا، وہیں ذہ بھاگم بھاگ شروع۔

اور اس چند لمحے کی عجلت اور بے چینی بھری نماز کے درمیان بھی ہر لمحہ کسی عورت، کسی دھندے کسی کمائی کا سودا ہی ذہن میں سما یا رہتا۔ کبھی کبھی تو ذہن اس زور سے دھڑکتا تھا جیسے اگر میں نے فوراً پل میں نماز پڑھ کر سلام نہ پھیرا تو یہ کم بخت دل سینے سے ہی باہر نکل آ کرے گا۔“

”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ محنت میں ہی عظمت ہے، تمہاری تنہائی میں محنت ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل بہت دیر سے تمہیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تمہاری پیشانی کی اس خاص چمک نے تم سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔“

”جسے آپ میری پیشانی کی خاص چمک سمجھ رہے ہیں، وہ میرے بختوں کی سیاہی ہے۔ اور کالک اور سیاہی جب جد سے زیادہ ہو جائے تو اس میں بھی ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔“

بزرگ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

”سبحان اللہ۔۔۔۔۔ میاں۔۔۔۔۔ کیا خوب بات کہی تم نے۔۔۔۔۔ سیاہی کی چمک۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔“

جی کچھ صفحے سیاہ کیے ہیں۔ لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔

”علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا، نماز وغیرہ سے کچھ خاص شغف نہیں رکھتے شاید۔“

”میں اسے دل کا معاملہ سمجھتا ہوں، دل چاہے تو پڑھ لیتا ہوں کبھی کبھی۔۔۔۔۔ ورنہ نہیں۔“

”سچ تو یہ ہے میاں کہ میں بھی بس حاضری لگانے کے لیے ہی پڑھتا ہوں۔ دل تو کہیں اور ہی اٹکا ہوتا ہے۔ کسی اور جوڑ توڑ میں، دھندے کی کسی گتھی کو سلجھانے میں۔“

”تو پھر ایسی حاضری کا فائدہ کیا۔۔۔۔۔؟ اس سے تو میری غیر حاضری ہی بھلی۔“

”میاں حاضری تو لگانی ہی پڑتی ہے نا۔ ورنہ اگلے امتحان میں بیٹھنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ جانتے ہونا، حاضری کی بنیاد پر ہی امتحانی داخلہ ملتا ہے۔ کچی پکی حاضری پوری ہوگی تو

ممتحن امتحان کے لیے بلائے گا۔ ورنہ بنا امتحان لیے ہی فیل کر دیا جائے گا۔ ایک دفعہ اس

ٹوٹی پھوٹی حاضری کی بنیاد پر اگلے جہاں کے امتحان تک تو پہنچ جاؤں۔ پھر وہاں ممتحن کے

آگے رو دھو کر کسی نہ کسی طرح صرف پاس ہونے تک کے 33 نمبر لینے کی کوشش کروں گا۔ ایک آدھ مضمون میں سلی یا کپارٹ آ بھی گئی تو کیا ہے۔ گھمسن گھمسن کر نکل ہی جائیں گے

آخر۔ اس لیے حاضری ضروری ہے۔ بنیادی شرط ہے۔ کچی حاضری ہو یا پکی، دل کی گہرائی اور خلوص دل سے ہو یا دکھاوے اور منافقت بھری۔ لیکن یہی حاضری آگے پیش ہونے کا کام

کہ یہ تو بہت سہل ہے۔ بس نیت کا کھیل ہے۔

اتنے میں جمعے کی اذان شروع ہو گئی۔ میں بے اختیاری میں ہی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ اب یوں گیٹ سے پلٹنا مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ رحمت اللہ نے دوبارہ حالانکہ مجھ سے نماز پڑھنے کا ذکر تک بھی نہیں کیا تھا۔ میں بھی دوسرے نمازیوں کے ساتھ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

شاید اس دن وہ میری زندگی کا پہلا سجدہ تھا جو میں نے بنا کسی خوف اور کسی جلدی، بنا کسی بے زاری اور بنا کسی مطلب اور لالچ کے ادا کیا تھا۔

اس دن مجھے پہلی بار مذہب سے ڈر نہیں لگا۔ کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے میرے اس پہلے سجدے میں بڑا اطمینان تھا طمانیت تھی اور سکون تھا۔

میں نماز پڑھ کر اسٹیشن سے ملحق مسجد کے باہر ہی کھڑا رحمت اللہ صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ جلد ہی وہ بھی نکل آئے اور ہم دونوں واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ وہاں سپیکر پر اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ لاہور جانے والی گاڑی کسی فنی خرابی کی وجہ سے تین گھنٹے دیر سے جائے گی۔ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

”لو بھئی۔۔۔۔۔ شاید قدرت کو میرا تمہارا ساتھ کچھ دیر کے لیے مزید منظور تھا۔ تم اگر گرا نہ مانو تو میں یہیں تمہارے پسندیدہ بیچ پر اپنی گاڑی کا انتظار کر لوں۔“

میں شرمندہ سا ہو گیا، شاید انہیں نماز سے پہلے والا میرا لہجہ اور رویہ یاد تھا۔ میں نے ان سے اپنے پچھلے سلوک کی معذرت چاہی۔ وہ مسکرا دیے۔

”ارے میاں معذرت کیسی۔۔۔۔۔ ہر بندے کا اپنی تنہائی پر مکمل اختیار اور مکمل حق ہوتا ہے۔ معذرت تو مجھے پیش کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ بہر حال بھی تمہیں لگی ہو یا نہ لگی ہو۔ پر مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیٹ پو جا ہونی چاہیے۔“

انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک لوہے کا خوبصورت سا چھوٹا ٹفن کیرئیر نکالا اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک رکھا۔ سادہ سی آلو ساگ کی سبزی، تھوڑا سا اچار اور چند پراٹھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا، پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مجھے بے رغبتی سے نوالے لٹو جتے دیکھ کر انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

میں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں کسی کے سامنے اس لیے بھی نہیں کرتے کہ کہیں ان کے مذہب پر لوگ شک نہ کرنے لگیں۔ لیکن یہ بزرگ تو بڑے مزے سے اپنی تہوئی چچی نمازوں کی داستان سنائے جا رہے تھے۔

”تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔۔۔ جس مسجد میں میں نماز پڑھنے جاتا تھا اس کے سامنے کی کھڑکی باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ میں اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلی صف تک پہنچ بھی جاتا تو پوری نماز کے دوران میری نظریں باہر بازار کی گلی میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ دراصل شروع شروع میں نماز میرے لیے بڑا اکتا دینے والا کام تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ”بورنگ (Boring)“ ہاں۔۔۔۔۔ بڑا بورنگ کام تھا۔ اس لیے میری نظر خود بخود کھڑکی سے باہر اٹھ جاتی تھیں۔ اور سچ بتاؤں رمضان میں کبھی دوست کھینچ کھانچ کر تراویح کے لیے لے جاتے تو تب یہ کھڑکیاں میرے بڑے کام آتی تھیں۔ تراویح کی لمبی لمبی رکعتیں بڑے مزے سے گزر جاتیں۔“

رحمت اللہ صاحب یہ بتاتے ہوئے ہنس پڑے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی میں نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔

”اور اب۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ اب کیا محسوس ہوتا ہے۔“

”اب لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ ٹھہراؤ آتا جا رہا ہے۔ لیکن ہم کیا اور کیا ہماری نمازیں میاں۔۔۔۔۔ سب دکھاوا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ

”آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔۔۔۔۔“

”مذہب میں کاملیت کروڑوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو یونہی زل زلا کر بس اپنی نیت کے طفیل ہی یہ دریا پار کر لیتے ہیں۔ یا پھر کسی کی دی ہوئی کوئی دعا کام آ جاتی ہے۔ منزل نہ سہی، کوئی سنگ میل ہی سہی۔۔۔۔۔ منزل سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے، ہم تو ذہن میں پہلا پڑاؤ پہلا سنگ میل رکھ کر ہی چلتے ہیں۔ جانے اس تک بھی اس مختصر زندگی میں پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ اپنا فرض تو بس قدم بڑھانا ہی ہے۔“

میں رحمت اللہ صاحب کی باتیں بڑے غور لیکن دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ میں آج تک مذہب کو بہت مشکل اور بڑا کٹھن کام سمجھتا تھا۔ لیکن رحمت اللہ کی باتوں سے لگ رہا تھا م

پران کی کھڑکی کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ انہوں نے سر باہر نکال کر میرے ماتھے کا الوداعی بوسہ لیا اور بولے۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ طلب اور اس چیز کی شدت کی چاہت تمہاری آنکھوں سے ہر لمحہ ٹپکتی ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مذہب تمہارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھو حماد میاں۔۔۔ مذہب تب تک ہی رکاوٹ لگتا ہے اور اس سے خوف محسوس ہوتا ہے جب تک آپ اس سے دور رہتے ہیں۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بے ضرر اور بہت دوست نما کوئی چیز ہے۔ مذہب سے دور نہ رہنا۔۔۔ اسے اپنا دوست بنا لینا۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ آباد رہو۔“

ٹرین نے دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی آخری حد تک چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ عجیب نورانی بزرگ ہاتھ بلاتے۔ تے ٹرین سمیت میری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ جو جاتے جاتے مجھے زندگی کے بہت۔۔۔ زاویے بس ایک ہی ملاقات میں بتا گیا تھا۔

OO

”دیکھو حماد میاں۔۔۔۔۔ چاہے جتنے بھی مصروف کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کے لیے وقت ضرور نکالا کرو۔ ہم اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کس لیے کرتے ہیں۔ اسی دودقت کی روٹی کے لیے ہی نا۔ یہ روٹی کا چکر ہی نہ ہوتا تو کبھی ہمہ وقت مسجدوں میں سجدے میں ہی نہ پڑے رہتے۔ لیکن ہمیں رزق تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چاہے چند نوالے ہی کھاؤ لیکن عبادت کی طرح خلوص سے کھاؤ اور اس نیت سے کھاؤ کہ اس کے بعد تم خدا کا شکر ادا کر سکو گے لہذا صرف کھانے پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی میں اس کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس طرح نہ تو کہ یہ اس مالک کا احسان ہے اور اس نیت سے اس نعمت کا فائدہ اٹھاؤ کہ یہ اس مالک کے شکر ادا کرنے کا ایک اور بہانہ ہے جو اس نے تمہیں فراہم کیا ہے۔“

مجھے اس نورانی چہرے والے بوڑھے کی باتیں سن سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے تو زندگی کبھی اس زاویے سے نہیں گزاری تھی۔ میں اپنے استعمال کی ہر چیز کھانے پینے، سواری، آرام اور تعیش کی چیزوں اور لمحات کو اپنا اور اپنی محنت کا حق سمجھا تھا۔ اپنے بڑوں کی دین سمجھتا تھا۔ بڑوں کی کمائی سمجھتا تھا۔ نعمت اور شکر کا تصور تو میرے دل میں کہیں دُور دور تک نہ تھا۔

میں نے کچھ دبے سے لہجے میں رحمت اللہ صاحب سے پوچھا۔

”کیا آپ تبلیغی ہیں۔۔۔۔۔؟“

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑے۔

”خوب۔۔۔۔۔ تو تم اتنی دیر سے میری باتوں کو تبلیغ سمجھ رہے ہو۔۔۔۔۔ بڑے بھولے

ہو میاں۔۔۔۔۔ میں کہاں اور تبلیغ کہاں۔ میں تو ایک وقت کی بھوک بھی برداشت نہیں کر سکتا، تبلیغ کے لیے تو پورا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں آپ کو یہ حق ملتا ہے کہ آپ دوسروں کو کچھ نصیحت کریں، کچھ سکھائیں، کیونکہ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ خود وہ کریں جو دوسروں کو کہتے ہیں اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔“

اتنے میں رحمت اللہ صاحب کی گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور اب اس کا سائرن بھی وقفے وقفے سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کی اور ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کا سوٹ کیس اٹھا کر انہیں ڈبے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئے جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھی تو میں اتر کر پلیٹ فارم

ہے۔ اسے یا تو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے یا پھر ملک بدر اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو انہوں نے باقاعدہ ایک قانون بنالیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس موضوع کی مخالفت پر پابندی لگا دی ہے باقاعدہ طور پر۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”اس جدید دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی سوچ، کسی کی زبان پر پہرے لگا دیں۔۔۔؟۔ اور پھر یہ لوگ تو آزادی اظہار رائے کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہ آزادی رائے اس وقت کیوں یا نہیں آئی انہیں جب یہ لوگ ایسا کوئی جبری قانون بنا رہے تھے۔“

جوزف نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا مشورہ دیا۔

”یہ تمام ڈھنڈورے دوسری قوموں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ تمہاری اس دن ہال میں کی گئی تقریر نے جانے کتنوں کی نیند اڑا دی ہوگی۔ یہ اس یونیورسٹی کے ایک سو تیس سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ کوئی اسٹیج پر آ کر باقاعدہ انہیں سچے لفظوں کے تازیانے لگا کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ایسی جرأت کو بھولتے نہیں۔۔۔۔۔ تاہی پسند کرتے ہیں۔“

میں نے جھلّا کر کہا۔

”یہ لوگ۔۔۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔۔۔ آخر یہ لوگ ہیں کون۔۔۔۔۔؟ اگر ان میں اتنی ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔۔ آخر یہ ہالوکاسٹ ہے کیا بلا۔۔۔۔۔؟“

جوزف نے ایک لمبی سی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ جانے بغیر یہاں سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ وہ دہلی دہلی سی آواز میں مجھے بتانے لگا۔

”یہودیوں نے اپنے اوپر ہونے والے نام نہاد مظالم کو سب سے زیادہ جرمنی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے جرمنوں پر 1298ء میں جرمن نائنٹ رنڈ فلیش کی سرکردگی میں جرمنی میں موجود ایک سو چھیالیس یہودی بستیوں میں قتل عام کا الزام لگایا گیا۔ 1336ء میں دوسو یہودی بستیوں کو تباہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ لیکن سب الزاموں سے بڑھ کر الزام یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گورین نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہٹلر پر لگایا کہ

ہالوکاسٹ

آخر کئی دنوں کی کوشش کے بعد مجھے جوزف سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہالوکاسٹ کا نظریہ کیا ہے۔ جوزف میری بات سنتے ہی ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا جیسے میں نے کوئی بہت ہی انہونی چیز پوچھ لی ہو۔ وہ سرگوشی میں یوں بولا جیسے ہم بہت بڑے جھوم کے درمیان بیٹھے ہوں حالانکہ وہاں نہر کے آس پاس دور دور تک ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”اس جگہ ایسی کوئی بات کسی سے پوچھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ موضوع یہاں پر ممنوعہ ہے۔“

میں نے حیرت سے جوزف کے اس پُر اسرار انداز کی طرف دیکھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ ایسی کیا بات ہے اس موضوع میں۔۔۔۔۔ اور پھر بارہ نے اس دن اس نظریے کے حق میں اپنی تقریر کے دوران اتنے زیادہ دلائل بھی تو دیے تھے۔ پھر یہ سب ممنوعہ کیسے ہو گیا۔“

سارہ ایک یہودی لڑکی ہے اور اس کے تمام دلائل ہالوکاسٹ کے حق میں تھے۔ میں اس نظریے کے مخالف دلائل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس نظریے کی حقیقت جان کر اس پر دوسروں سے بحث ضرور کرو گے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا تم بھی اس نظریے کے مخالف ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں کیا ایک دنیا اس مفروضے کی حقیقت سے انکاری ہے۔ لیکن ان یہودیوں کے لیے یہ اس قدر مقدس نظریہ ہے کہ وہ کسی کا اس کے خلاف بولنا تو دور، سوچنا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ایسی کوئی بھی بات کرنے والوں کی زبان بند کرنا انہیں خوب آتا

اُس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ختم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ یہ تعداد 60 لاکھ تک بتاتے ہیں۔ اور یہودی اسی عظیم الشان اموات کے نظریہ کو ہالوکاسٹ کہتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”لیکن اتنی بڑی تعداد میں اگر یہودی مارے گئے ہوں گے تو ان کی موت کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم اور ہٹلر کا دور تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔“

”کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ثبوت ڈھونڈنے والوں اور اس نظریے کے خلاف جانے والوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی آسٹریا کی ایک عدالت نے تاریخ کے ایک استاد پروفیسر ڈیوڈ ارونگ کو تین سال کی سزائے قید سنائی ہے۔ صرف اس جرم میں کہ اُس نے ہالوکاسٹ کے دوران یہودیوں کے قتل عام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”حیرت ہے لیکن یہودی اس پروپیگنڈے کے ذریعے کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”اپنی قوم اور اپنی نسل کے لیے ایک الگ اور آزاد سلطنت، برطانیہ اور امریکہ نے یہودی رہنماؤں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران یقین دلایا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد یہودی سلطنت قائم کر دی جائے گی اور یہ ریاست فلسطین کی مقدس سرزمین پر قائم ہوگی۔ روس نے بھی اس معاملے میں یہودیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔“

جوزف نے مجھے رچرڈ ہارورڈ (Richard Harward) کی کتاب ”کیا واقعی 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔“ فرینچ رائٹر پال راسی نیر کی کتاب ”یورپی یہودیوں کا ڈراما“ امریکی مصنف ڈیوڈ ہوگن کی تصنیف ”مسلط شدہ جنگ“ اور ایسی بہت سی دوسری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ میرے لیے واقعی یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اسی دن شہر کی مختلف گمنام لائبریریوں سے یہ تمام کتابیں منگوا لیں کیونکہ شہر کی بڑی لائبریریوں میں ان کتابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں ان کتابوں کو پڑھتا گیا۔ نت نئے راز میرے اندر واہوتے چلے گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ہالوکاسٹ کا یہ پرہ پیگنڈہ تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جرمنی سے تمام اتحادی افواج خائف تھیں، یہودیوں نے جو اس

وقت جرمنی میں اسلحہ سازی کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے، اتحادی افواج اور امریکہ کا درپردہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد انہیں آزاد ریاست بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

جرمن یہودی سازشوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم ہار گئی، ہالوکاسٹ کے داویلے سے یہودیوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور فلسطین تک ان کی بستیوں کی رسائی میں اتحادی ملکوں نے پوری مدد کی۔ اور رفتہ رفتہ ہالوکاسٹ کے موضوع کو ہی مقدس گائے بنا دیا گیا تاکہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہ بولے اور نہ ہی تحقیق کی نوبت آئے۔ مجھے ان سب کتابوں سے بس ایک ہی حقیقت کا واضح اشارہ ملا کہ۔۔۔۔۔ ”یہودی دراصل سازش کا دوسرا نام ہے۔“

اب مجھے کسی ایسے موقع کا انتظار تھا جب میں ان یہودیوں کے اس غرور کو توڑ سکوں۔ کامران نے میرے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے کہ میں ان چکروں میں نہ پڑوں۔ اسے مجھ سے زیادہ سارہ کی فکر تھی کہ وہ میرے دوست کامران کے بارے میں کیا سوچے گی جب کہ ابھی تک سارہ کامران کے نام اور شکل سے بھی واقف نہیں تھی۔

اور پھر ایک ہی ہفتے کے دوران مجھے وہ موقع مل ہی گیا۔ ہیومنٹریگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو مختلف موضوعات پر ٹرم پیپر لکھنے کے لیے کہا، موضوع کی کوئی قید نہیں تھی لیکن موضوع پہلے بتانا ضروری تھا کیونکہ اسے طالب علم کے نام کے ساتھ نوٹس بورڈ پر چپکانا ضروری تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر وہ فہرست لگائی گئی جس کے اندر موضوعات بھی واضح کیے گئے تھے اس دن سب لوگ میرے نام کے سامنے مضمون کی فہرست میں ”ہالوکاسٹ“ کا عنوان دیکھ کر ہی سراسیمہ ہو گئے۔ چند لمحوں میں ہی پوری یونیورسٹی میں سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کا ایک ریلا سا بہہ نکلا۔ میں لائبریری سے نکل رہا تھا کہ پریشان سی ربیکا اپنے کٹے بال جھلاتی جانے کہاں سے آنکلی اور بنا کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی مجھے راہداری کے ایک سنان گوشے کی طرف لے گئی۔

”میڈی۔۔۔ تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔۔۔؟“

”کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس

ہوئی۔“

سنگِ دل

میں بنیادی طور پر مذہب کو انسان کا بے حد ذاتی فعل سمجھتا تھا۔ اس دن ٹرین والے بزرگ رحمت اللہ سے ہوئی ایک ملاقات نے میرے اندر سے مذہب کا بہت سارا خوف نکال دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا کہ مذہب کو دوسروں کے ساتھ ڈسکس بھی کیا جاسکتا ہے اور اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی بُرائی بھی نہیں ہے۔

جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اپنی چاہت کے راستے میں اپنے مذہب کو مائل سمجھتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب بزرگ تھا جو پل بھر میں میری روح تک کھنگال کر اسے جھنجھوڑ گیا تھا۔ بہر حال اب مجھے میرا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

درمیان میں ایک دفعہ شاکر کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ وہ کمشنر صاحب کو لے کر اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ الیکشن قریب آ رہے تھے اور اب بابا کی بڑے گھروں کی یا ترا بھی بڑھنے لگی ہوگی۔ نگہت نے بتایا کہ وہ دونوں موتی ایمان کو دے آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ایمان بہت دیر تک وہ دونوں موتی ہاتھوں میں لیے گم سم سی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے نگہت سے پھر یہی درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سمجھائے کہ میری ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہذا میں یہ تیاگ ترک کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔ نگہت اس سے اُلجھ پڑی تھی کہ جب اسے میری کوئی فکر ہی نہیں ہے تو پھر میری در بدری اور میری خواری کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دے۔ اسے خواہ مخواہ خود کو مجرم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا ہوں، ایمان کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نگہت کی یہ سخت جوابی سن کردہ زہرہ جیسے ایمان کس قدر آزرده ہوئی ہوگی۔ میں یہ سوچ کر دکھی ہو گیا۔ لیکن نگہت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ چپ بھی رہتی تب بھی حیا ضرور اپنی بہن سے الگ پڑتی۔ نگہت کو خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ جانے کیوں حیا کو مجھ پر اور میری ایمان

”تم نے ہالوکاسٹ پر ٹرم پیپر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ یونیورسٹی یہودیوں کی ہے اور اس کی تمام انتظامیہ یہودی ہے۔ پلیز میڈی۔۔۔۔ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لو۔۔۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

اُس نے واقعی اپنے گورے گورے سے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

”کچھ نہیں ہوگا، تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اگر یہ لوگ دوسری قوموں اور مذاہب کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں خود سے کم تر سمجھتے ہیں تو انہیں بھی آئینہ دکھانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔“

”اوہ میڈی۔۔۔۔ تم نہیں جانتے میں تمہارے لیے کتنی پریشان ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میں نے چونک کر اُس بظاہر لابی سی لڑکی کو دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے لگا دُور کہیں پھر سے محبت کی راج ہنسی پر پھیلا رہی ہے۔۔۔۔“

میں جانتا تھا کہ ایمان کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جن لڑکیوں کے دلوں کے ہر کواڑ کی چابی ان کے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے۔ ان کی ہر پسند نا پسند اپنے بزرگوں کی پسند سے مشروط ہوتی ہے، ان کے دلوں کا ہر راستہ ان کے باپ کی بیٹھک سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ بیٹھک جہاں سے آگے بڑھنے کی اجازت ملنے پر ہی وہ اپنے دل کا دروازہ کسی اجنبی کے لیے کھولتی ہیں۔ ورنہ یہ دروازے یہ کواڑ ساری عمر بند ہی رہتے ہیں۔ آپ لاکھ سر پنٹھیں، ماتھے کو ٹکرائیں، لہو لہان کر لیں پر وہ بہری بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ پرستان کی ان پریوں کی شہزادی کی طرح کہ جس کے محل کے دروازے پر کوئی اثر دھا، کوئی دیویا کوئی جن پہرہ دینے کے لیے ہمہ وقت موجود ہی رہتا ہے۔

لیکن مجھے جانے کیوں اپنی محبت کی طاقت پر کبھی شک نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس اب جینے کے لیے اس محبت اور اس کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں اسی پل خود بھی مر جاتا۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی اس پتھر کی دیوار سے تا عمر سر ٹکراتا تھا۔ بنا کسی تیشے اور اوزار کے صرف اپنے خالی ہاتھوں اور کمزور ناخنوں کی مدد سے اس پہاڑ کو ادھیڑ کر ایک نہر کھودنا تھا۔ میرے ناخن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے، چھل چکے تھے، ہاتھ لہو لہان تھے اور پتھر کا پہاڑ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جگہ دیے ہی قائم تھا۔ لیکن میرا حوصلہ ابھی جوان تھا۔ میری ہمت میرے ساتھ تھی۔ سو میں بھی اپنی رفتار کے ساتھ کسی نہ کسی صورت مشقت جاری رکھے ہوا تھا۔ بس شرط سانسوں کی تھی۔۔۔۔۔ وہ جب تک ساتھ دیتیں۔۔۔ میں رکنے والا نہیں تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس راستے میں مجھے جو بھی لوگ ملتے گئے انہوں نے کسی نہ کسی طور میری مدد ہی کی تھی۔ میرا راستہ سہل ہی کیا تھا۔ شاکر، نگہت، صدیقی صاحب، غفور اور اب

یہ صوفی رحمت اللہ۔۔۔۔۔ بھی نے میری ہمت کسی نہ کسی طرح سے بڑھائی ہی تھی۔
رحمت اللہ صاحب نے تو ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا تھا۔ اور میں نے اب اسی راستے پر
چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر مولوی صاحب کی نظر میں مذہب ہی میری کمی اور میری خامی تھی تو میں
نے اب تک اس کمی کو اس خامی کو دور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ لوگ مذہب سے
محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو کیا ہوا اگر میں اپنی محبت کی وجہ سے مذہب کی
طرف قدم بڑھالوں۔۔۔۔۔؟ رحمت اللہ صاحب نے کہا تھا کہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی
ایک کامل دین ہوتا ہے۔ تو پھر میں بھی اگر ان ہزاروں نو سیکھیوں کے ساتھ مل جاؤں تو اس
میں کیا بُرائی ہے؟ مانا کہ یہ سب میں اس وقت ایمان کو پانے کے لیے ہی کرتا لیکن اپنی محبت
کو ہار دینے اور ہتھیار ڈال دینے سے تو پھر بھی یہ کہیں بہتر تھا۔ دل میں کوئی خلش تو نہیں باقی
رہتی کہ کاش یہ بھی کر کے دیکھ لیتے۔

وہ جاتی گرمیوں کے دن تھے اور ستمبر کا مہینہ اور خزاں سر پر تھی۔ میں نے اسٹیشن کے چائے والے لڑکے کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے جگا دے۔ وہ رات کی شفٹ میں اسٹیشن پر پھیری لگا کر ایک مخصوص لوہے کے چکر میں شیشے کے گلاس پھنسائے ان پر ایک لوہے کی پتری گھما کر آواز نکال کر چائے بیچتا تھا۔ اور مجھ سے خاصی دوستی ہو گئی تھی اس کی۔

اب رہا نام تھا اس کا، باہر نے مجھے ٹھیک ساڑھے چار بجے۔ ”چائے گرم“ کے نعرے کے ساتھ ہی اٹھا دیا۔ بہت دنوں سے میں نے بیڈ ٹی نہیں پی تھی، سو اس نے آج یہ خواہش بھی پوری کر لی۔ البتہ یہ بیڈ ٹی نہیں بلکہ بیچ ٹی تھی کیونکہ ویٹنگ روم میں پڑے وہ لکڑی کے تختے ہی اب میرا بستر تھے۔ چائے پی کر میں جلدی سے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور باہر نکلتے نکلتے اسٹیشن کے قتل سے منہ پر پانی کے دو چار چھینٹے بھی مار لیے۔ باہر اکا دکا تانگے موجود تھے جو مٹی کے تیل والی بڑی بڑی لائٹنیں اپنے تانگوں پر لٹکائے صبح کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے وہیں سے خیر و تانگے والے کو آواز لگائی۔ خیر و تانگہ ہانکتا ہوا قریب آ گیا۔

”خیر تو ہے بابونمبر 137۔۔۔ اتنی صبح سویرے کہاں کا ارادہ ہے۔“

وہ ہمیشہ مجھے بابونمبر 137 ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ میں نے اسے پرانے محلے چلنے کا کہا۔ اس نے تانگہ آگے ہانک دیا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کوئٹہ سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم

نماز کے لیے اسی مسجد میں جاتا جہاں مولوی صاحب جماعت کرواتے تھے۔ بیچ میں ظہر، عصر اور مغرب کا وقت اسٹیشن پر ڈیوٹی کے دوران ہو جاتا تھا لہذا یہ نمازیں مجھے اسٹیشن پر ہی ادا کرنی پڑتی تھیں۔

میں نماز پڑھنے کو ہمیشہ سے ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنی تنہا نماز کسی کے سامنے پڑھنے سے اس کی حرمت اور اس کی عظمت متاثر ہوتی تھی۔ جیسے کچھ دکھاوے کا پہلو نمایاں ہو رہا ہو شاید اسی لیے اسٹیشن پر کبھی کسی نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

عبداللہ نے بھی مجھے فجر اور عشاء کی نمازوں پر وہاں آتے جاتے دیکھا لیکن وہ بھی ایک عجیب جوان رعنا تھا۔ جب بھی مجھ سے ملا، بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا رنج، غصہ یا تناؤ نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں یوں اس مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے روزانہ ایک سرد جنگ لڑ رہا ہوں۔ جس کی کڑواہٹ روز بروز مولوی صاحب کے چہرے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

عشاء کے بعد مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے یا حدیث کو لے کر پندرہ منٹ کا ایک درس دیتے تھے جسے سننے کے لیے چند نمازی پیچھے رک جاتے تھے۔ جن میں اب میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا تھا۔ عبداللہ بھی ضرور اس درس میں شامل ہوتا تھا بلکہ حدیث یا تفسیر کی کتاب طاق پر سے اٹھا کر لانے اور واپس رکھنے کی ڈیوٹی بھی عبداللہ کی ہی تھی۔

لیکن شاید مولوی صاحب نے بھی یہ طے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ میں سلام کرتا تو جواب دیتے اور پھر وہی لا تعلقی۔۔۔۔۔ ان جیسے شریف اور وضع دار شخص سے کچھ ایسی ہی توقع کی جاسکتی تھی۔ میری فجر اور نماز عشاء کا یہ سفر جاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی نمازی درس کے دوران کوئی مسئلہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا جس کا مولوی صاحب کبھی تفصیل اور کبھی تخصیر کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ایک نمازی نے مولوی صاحب سے چھ کلمے سنانے کی اور انہیں یاد کرانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس سے پوچھا کہ اسے اس وقت کتنے کلمے زبانی یاد ہیں۔ اس شخص نے کہا

ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے پُرانے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر میں نے خیر کو دو ہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خیر نے تانگہ ایک طرف لگایا اور حسب معمول اپنے تانگے کے ساتھ لٹکے ہوئے پُرانے سنگل بینڈ کے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے ان تانگے والے، رکشہ والوں اور ٹیکسی چلانے والوں کی اس مخصوص عادت پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، زمانہ ادھر کا ادھر ہو جائے پر یہ لوگ خبریں ضرور سنتے اور بعد میں آپس میں بیٹھ کر اس پر تبصرے کرتے جیسے وہ کوئی تانگہ یا رکشہ اسٹینڈ پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ جیسے کسی اسمبلی کے رکن ہوں اور اگر وہ تبصرہ نہ کریں یا خبریں نہ سنیں گے تو جیسے ملک کا بے حد بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس عام طور پر اسمبلیوں تک پہنچنے والے اسمبلی میں اس رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس کی توقع ہم ان تانگہ بانوں سے کر سکتے تھے۔

میں خیر کو دو ہیں خبروں کی تلاش میں ریڈیو کی سوئی گھماتا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد ابھی تقریباً خالی ہی تھی، اکادکا نمازی آنے لگے اور پھر جماعت کے وقت مولوی علیم مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے امام کی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھا کر انہوں نے سلام پھیرا اور پھر دُعا کے لیے مقتدیوں کی طرف پلٹے۔ جیسے ہی انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ جیسے سن ہی ہو کر رہ گئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ خیال آیا اور انہوں نے دُعا ختم کی۔ سب نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل آئے۔ میں بھی مولوی علیم سے بنا کسی بات کے باہر آیا اور خیر کو دو واپس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ خیر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”کیا بات ہے بابو۔۔۔۔۔ صرف نماز پڑھنے اتنی دُور تک آئے تھے۔۔۔ کیا کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

خیر نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ سچ ہے محبت بھی تو ایک منت کی طرح ہی ہوتی ہے۔ بلکہ محبت سے بڑی منت اور بھلا کوئی دوسری منت کیا ہوگی۔

اس دن کے بعد سے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ میں ہر روز صبح فجر اور پھر عشاء کی

مولوی صاحب نے بھی اب جیسے میری موجودگی سے اک سمجھوتہ ہی کر لیا تھا کیونکہ وہ ہاں گئے تھے کہ میں نے کبھی کسی مقصد کے لیے بھی براہ راست ان سے بات کرنے کی یا پھر ان کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی جب مولوی صاحب کسی وجہ سے جماعت کروانے کے لیے نہیں آ پاتے تھے تب عبد اللہ یہ فریضہ سرانجام دیا کرتا تھا۔ اُس دن البتہ میں عبد اللہ سے ضرور براہ راست کوئی سوال کر لیا کرتا تھا۔ جو پچھلے کچھ دنوں سے میرے ذہن میں موجود تو ہوتا لیکن مولوی صاحب کی موجودگی کی وجہ سے زبان پر نہیں آ پاتا تھا۔ عبد اللہ بھی بڑے کھلے دل سے میرے سوال سنتا اور بہت تفصیل سے ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں چاہے میری محبت کی وجہ سے ہی کسی پر دھیرے دھیرے مجھ پر میرا مذہب کھلنے لگا تھا۔

عبد اللہ نے کبھی اس دوران تنہائی میں بھی مجھ سے کسی ذاتی مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ اس دوران عبد اللہ اور مولوی صاحب کی زبانی بہت سی باتیں جو پہلے میری نظر سے اوجھل تھیں مجھے اب ان کی سمجھ آنے لگی تھی۔ خیر و مانگے والے نے تو اب یہ روز کا معمول بنا لیا تھا کہ وہ فجر اور عشاء کے وقت کوئی اور سواری اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اور میرے اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے ہی وہ ان اوقات پر اپنا تانگہ سب سے آگے بڑھا کر کھڑا میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اُسے مجھ سے میری ”منت“ کی وجہ سے عقیدت سی ہو گئی تھی اور اس کی بدولت سارے ریلوے اسٹیشن کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ حماد بابو کسی منت کے سلسلے میں روزانہ کہیں جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان سبھی نے مجھ سے بنا کوئی بات کہے از خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ ضرور یہ منت کسی محبت کے سلسلے کی ہی ہوگی۔ شاید میری عمر ہی ایسی تھی۔ یا شاید محبت خود عاشق کے روم روم سے نکلتی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کی چال ڈھال اس کا چہرہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہے کہ دیکھو۔۔۔ یہ جارہا ہے وہ شخص جس نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے۔ یہی ہے وہ گناہ گار جو سنگسار کیے جانے کا حق دار ہے۔

بہر حال ان دنوں اسٹیشن پر میری اور میری ”منت“ کی بڑی دھوم تھی۔ صدیقی صاحب بھی کبھی کبھی دفتر چھوڑ کر ڈرائی پورٹ کے گوداموں کی طرف چلے آتے اور مجھے کہیں تنہا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر میرے بال باتھ بڑھا کر بکیر دیتے اور بنا کچھ کہے واپس چلے جاتے۔

دو۔ مولوی صاحب نے وہ دو کلمے اس سے سنے اور پھر تیسرا کلمہ اُسے یاد کروایا۔ میں بھی وہیں بیٹھا دل ہی دل میں وہ تیسرا کلمہ یاد کرتا رہا۔ پھر اسی طرح اگلے دن انہوں نے اسی نمازی سے عشاء کے بعد تین کلمے سنے اور چوتھا یاد کروایا۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہراتا اور دل ہی دل میں اُسے پکارتا رہا۔ اسی ترتیب سے پانچویں دن پانچواں اور چھٹے دن چھٹا کلمہ انہوں نے اُسے از بر کروادیا۔ ساتویں دن درس کے بعد مولوی صاحب نے خود اس نمازی سے چھ کلمے سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے فٹافٹ چھ کے چھ کلمے سنا دیے۔ مولوی صاحب نے خوش ہو کر اس نمازی کی پیٹھ تھپکی۔ میں نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔

”میں نے بھی یہ چھ کلمے یاد کر لیے ہیں جناب۔۔۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی تصحیح کے لیے ایک مرتبہ سنا دوں۔“

مولوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ عبد اللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً ہی چھپا لیا۔ مولوی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ سر ہلا کر اجازت دے دی۔ میں نے بھی چھ کے چھ کلمے مولوی صاحب کو سنا دیے۔ ایک آدھ جگہ میں اٹکا تو مولوی صاحب نے ہی تصحیح بھی کر دی، میں نے چھٹا کلمہ ختم کیا تو مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا۔ ”جذاک اللہ۔“

ان کے فوراً بعد عبد اللہ کے منہ سے بھی یہی دُعا نکلی۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا جو نمازی بھی مولوی صاحب سے کچھ بتانے یا سکھانے کی فرمائش کرتا میں بھی اپنے آپ ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ سب از بر کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایمان مفصل، ایمان مجمل، دُعاے قنوت، مختلف مسنون دُعاں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ مجھے بھی بچپن میں مولوی صاحب ہی کی طرح کے ایک مولانا نے سکھایا تھا۔ جیسے ہر گھر میں مسلمان بچوں کو سکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ آتا ہی تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے جوانی کی حدوں میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دُعاں بھولتی گئیں اور ان کی جگہ میرے ذہن میں انگلش گانے اور ان کے سنگرز کے نام بھرتے چلے گئے۔ ان چند دنوں میں مجھے پھر سے وہ سب کچھ از بر ہو گیا تھا جسے میں کئی سالوں سے نہ دھرانے کی وجہ سے بھلا بیٹھا تھا۔

ٹرم پیپر

جس دن سے میں نے ”ہالوکاسٹ“ پر اپنا تحقیقی پرچہ لکھنے کا اعلان کیا تھا اسی دن سے سر آئزک بھی مجھ سے کچھ کچھ کچے سے رہنے لگے تھے۔ جوزف سے ملاقات ہوئی تو اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تمہیں روکنا بہت مشکل ہوگا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“
ریکا جانے کلاس میں زیر لب کیا کچھ پڑھتی رہتی اور مجھ پر آتے جاتے پھونکیں مارتی رہتی۔ سارہ البتہ پرسکون تھی لیکن اس کا گینگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔ اور پھر اس دن وہی ہوا جس کا کامران بہت دنوں سے خدشہ ظاہر کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی جلدی خالی ہو گئی تھی کیونکہ شہر میں کسی جلے کی وجہ سے آس پاس کی سڑکوں کو بند کر کے متبادل راستوں سے ٹریفک گزارنے کا اعلان کیا گیا تھا۔

انتظامیہ نے اسٹوڈنٹس کی سہولت کے لیے ایک لیکچر پہلے ہی یونیورسٹی کی بسیں چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دن کامران کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ میں اور ریکا مرکزی عمارت سے نکل ہی رہے تھے کہ کہیں بے جم، ڈیوڈ اور ٹینا نمودار ہو گئے۔ جم حسب معمول میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے تم نے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم اس یونیورسٹی سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اور دوبارہ پلٹ کر اس طرف کا رخ بھی نہ کرنا۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو۔۔۔؟“

ڈیوڈ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

”تو پھر ہم تمہارا بندوبست کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔“

عجیب سی شفقت تھی ان کے انداز میں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، کیے جاؤ یہ محبت کا جرم۔۔۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں گھبرانا نہیں۔۔۔۔۔

شا کر سے گا ہے بگا ہے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ عبد اللہ نے شاید اُسے مسجد میں میری روزانہ کی حاضری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ نہ بولا۔۔۔۔۔ بس مجھے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ محبت شاید پیدا ہی سب کوڑلانے کے لیے ہوتی ہے۔ واپسی پر نگہت سوچی آنکھوں کے ساتھ برآمدے کی اوٹ سے باہر نکلی اور اُس نے میرے ہاتھ پر کوئی امام ضامن باندھ دیا۔ لوجی۔۔۔۔۔ یہ تو خیر و کی منت والی بات بھی سچ ہی ہو گئی۔ مجھے نگہت سے اُس ناز ادا کی حالت پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی اس کے آنسو مجھے دیکھ کر تھم نہیں پاتے تھے۔ کچھ پوچھ بیٹھتا تو اسے سنبھالنا واقعی مشکل ہو جاتا۔ امام ضامن باندھ کر اس نے بڑے پیار سے میرے بال سنوارے اور سر پر ہاتھ رکھ کر یوں دُعا دی جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ اس ایک محبت نے مجھے کتنے لوگوں کی نظروں میں معتبر بنا دیا تھا، مجھے اس دن احساس ہوا کہ محبت بیک وقت ہمیں کئی نظروں میں معیوب کر دیتی ہے اور کئی نظروں میں ہمیں محترم بنا دیتی ہے۔ محبت ایک ہی وقت میں زہر اور اسی لمحے میں تریاق کا کام دیتی ہے۔

جم نے میرا گریبان پکڑ لیا، ربیکا زور سے چلائی۔
 ”ہے جم۔۔۔ چھوڑ دو میڈی کو۔۔۔ تم وحشی ہو۔“
 لیکن جم نے میرا گریبان نہیں چھوڑا۔

”میرا گریبان چھوڑ دو جم۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں۔۔۔۔۔“

اتنے میں سارہ جانے کس جانب سے دوڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور میری بات اُدھوری رہ گئی۔ سارہ نے آتے ہی ایک جھٹکے سے میرا گریبان جم کے ہاتھوں سے چھڑوا دیا اور چلا کر بولی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے جم تم گلی کے غنڈوں جیسا برتاؤ کرو گے۔۔۔۔۔ تم سے یہ توقع نہیں تھی مجھے۔“

جم سارہ کو دیکھ کر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں ربیکا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ مجھے آوازیں دیتی ہوئی پیچھے چلی آئی۔

”جم کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔“

میں نے غور سے سارہ کی طرف دیکھا۔

”شاید وہ سچ کو برداشت نہیں کر پار ہا۔ سچ کو ہنسم کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔“ میں سارہ کو یونہی گم صم کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ربیکا نے راستے بھر جم کو دل کھول کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ میں ہانڈ پارک کے علاقے میں واقع اس کے پارٹمنٹ تک اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ پکاؤلی کی مرکزی سڑک سے دائیں مڑتے ہی وہ بچوں کی طرح چلانے لگی۔ سڑک کے کنارے ایک کینڈی فلاس بیچنے والا جو کروں کے لباس میں کلاؤن بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے بچوں کو مختلف اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے ہنسا رہا تھا اور انہیں لچھوں والی مٹھائی خریدنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ بچپن میں ہم اسے لچھوں والی مٹھائی ہی تو کہتے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر گلیوں میں ایک بوڑھا سا بابا شیشے کے بڑے سے مرتبان میں بہت سی روٹی کے گالوں جیسی سفید اور گلابی مٹھائی کے گولے لے کر آتا اور اُن کو پھر ایک موٹے سے تنکے کے گرد خوب اچھی طرح گھما کر لپیٹ کر ہمیں بہت سے گولے تھما دیتا۔ یہاں پر انہی روٹی کے گولوں کو کینڈی فلاس کہا جاتا تھا۔

ربیکا کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر مجھے بھی گاڑی سڑک کے کنارے لگانا پڑی۔ وہ جلدی سے اچھل کر گاڑی سے اتر کر بھاگ کر کلاؤن کے پاس پہنچ گئی اور پھر وہاں روٹی کے دو بہت بڑے سے پیلے اور گلابی گولے بنا کر مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ واقعی اس لڑکی کو ایک کروٹ بھی چین نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے بھی نیچے اترنا پڑا۔ پھر ہم بہت دیر تک وہیں سڑک کنارے پتھر کی لمبی سی بس پر بیٹھے کلاؤن کی بکری کر داتے رہے۔ ہمارا بچپن بڑھا پے۔ تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اندر کہیں دبک کر بیٹھا رہتا ہے اور موقع ملتے ہی جھم سے باہر نکل آتا ہے۔ ہمیں جیبوں میں کینچے اور اخروٹ بھرنے پر اکساتا ہے۔ تنہا سڑک پر زور سے سیٹی مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ راہ چلتے ٹھیلے والے سے برف کے گولے پر شربت ڈلوا کر مزے سے چوسنے پر مائل کرتا ہے۔ کھٹی میٹھی گولیاں اور چوڑن گھردالوں سے چھپ کر منہ میں بھرنے پر شاباش دیتا ہے۔ وہی بچپن آج ربیکا کے اندر سے بھی چھلک رہا تھا۔ اور اس لڑکی کے بہانے میں نے چند بل اپنے بچپن کے پھر سے بتالیے۔

لیکن اس وقت ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ کل کا سورج کیا لے کر آنے والا ہے۔ اگلے دن یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ میری اور جم کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ہمارا جرم تھا یونیورسٹی کے ماحول اور ڈسپلن کو خراب کرنا اور اس ایکسپلینیشن (Explanation) کا جواب ہمیں آج زبانی اور تین دن کے اندر تحریری طور پر جمع کر دانا تھا۔ ربیکا اس بات پر بے حد سنجیدہ تھی۔ ”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ساری یونیورسٹی جانتی ہے کہ سارا تصور جم کا تھا۔ اُسی نے تمہارا راستہ روکا تھا اور تم نے تو جواب میں اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ میں خود سر آ سڑک سے بات کروں گی۔۔۔۔۔ میں دیکھتی ہوں تمہارے خلاف کوئی کیسے ایکشن لیتا ہے۔“

وہ اپنے آپ ہی شدید غصے میں بڑبڑائے جا رہی تھی اور جانے کب سے لان میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ جیسے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر اپنا غصہ نکال رہی ہو۔ مجھے اس کے اس ناراض سے انداز پر ہنسی آ گئی۔

”تم بیٹھ کر بھی اپنا غصہ نکال سکتی ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اُس نے مجھے بھی غصے سے دیکھا اور اپنی چہل قدمی اور بڑبڑاہٹ ویسے ہی جاری

خاصے اسٹوڈنٹس وہاں موجود تھے جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا واقعہ ہوتے دیکھا ہے۔ انہی میں ایک نام مس سارہ آنرک کا بھی ہے جو خود اس واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔“

سارہ کے نام پر سر آئنگ نے چونک کر میری طرف دیکھا جسے انہیں میری زبان سے سارہ کا نام بطور گواہ سننے کی اُمید بالکل ہی نہ ہو۔ یہی حال باہر بیکا کا ہوا جب میں نے اُسے کمرے سے نکل کر بتایا کہ میں نے بطور گواہ سارہ کا نام انگوائری کمیٹی کو دے دیا ہے۔ سارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”اُف میڈی۔۔۔۔ یہ کیا غضب کر دیا تم نے۔۔۔۔ اب تمہیں یونیورسٹی سے ریسٹی
گیٹ Restigate ہونے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی نہیں۔

00

”لیکن جم کے بیان کے مطابق تم اس پر حملہ آور ہوئے تھے اور بات بہت آگے تک بڑھ چکی تھی۔“

مجھے جم کے بیان پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، میں نے سکون سے جواب دیا۔
 ”میرا بیان اب بھی یہی ہے کہ بات معمولی سی تھی اور اسی لمحے ختم ہو گئی تھی۔ اگر
 انتظامیہ چاہے تو اپنے طور پر بھی اس واقعے کی تحقیق کر داسکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اچھے

پھر وہی نظر

میں اُسی باقاعدگی سے مولوی علیم کی مسجد میں دن کی دو نمازیں پڑھنے جا رہا تھا۔ اس دوران ایک اور واقعہ درپیش آ گیا۔ کوئٹہ سے کراچی کے لیے سہ پہر چار بجے تک قریب بولان میل نامی ایک گاڑی روزانہ نکلتی ہے۔ جس کا کوئٹہ سے نکلنے کے بعد تیسرا اسٹیشن چھ نامی شہر پڑتا ہے۔ شہر کیا ہے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی وجہ شہرت یہاں انگریز سرکار کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی جیل ہے جو ”مچھ جیل“ کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جزائر انڈیمان کے کالا پانی جیل کی جو شہرت تھی وہی اس مچھ جیل کی بھی تھی۔ اس قصبے کے درمیانے طبقے کے لوگ صبح کراچی سے آتی ہوئی اسی بولان میل کی پہلی گاڑی سے کوئٹہ آ جاتے تھے جو صبح آٹھ بجے کے قریب کراچی سے مچھ پہنچتی تھی۔ دن بھر اپنے کام پنا کر وہ شام کو اسی میل کی ڈاؤن ایکسپریس سے چار بجے دوبارہ مچھ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جو انہیں ڈیڑھ گھنٹے میں مچھ پہنچا دیتی تھی۔

اس دن صدیقی صاحب کے کوئی دوست جوان دنوں مجھ ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے اپنے گھر والوں کے ساتھ صدیقی صاحب کی دعوت پر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ شام کی گاڑی سے واپس مجھ جا رہے تھے۔ بیوی بچوں نے شاید کوئٹہ کے بازاروں سے کبھی چیزوں کا ایک آدھ نمونہ ضرور خریدا تھا تبھی ان کے ساتھ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے کا وقت تھا لہذا صدیقی صاحب ادھر ادھر سے قلیوں کو بلوا کر جلدی جلدی ان کا سامان گاڑی کی بوگی میں رکھوا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا تو میں بھی مدد کے لیے چلا آیا۔ غفورے کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اس سے اور ایک دوسرے بوڑھے قلی سے سوٹ کیس کے لیے اور گاڑی کی طرف پلٹا، نظر اٹھائی تو عبد اللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ عبد اللہ مجھے پون قلیوں کے لباس میں سوٹ کیسوں اور بکسوں کے بوجھ تلے لدا پھندا دیکھ کر

ان کا ڈپالس دو بوجیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ عبداللہ عورتوں کو اندر بٹھا کر خود باہر میرے پاس

ایک چمک سی لہرائی۔ اور پھر اُس نے گھبرا کر نظر جھکالی۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اب میری سانسیں تھم جانی چاہئیں، مزید زندگی بے کار ہے۔

مجھے اپنے نصیب پر اتنا رشک پہلے کبھی نہیں آیا۔ جتنا اس لمحے آیا تھا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکالیا۔ ٹی ٹی نے تیسری اور آخری سیٹی بجائی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ عبداللہ بھی آ کر دوسری جانب اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ عبداللہ کو الوداع کہنے کے لیے اوپر اٹھ گیا۔ عبداللہ نے بھی ہاتھ ہلایا، میں اضطراری طور پر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے کوئی بچہ اپنے کسی عزیز از جان کھلونے کو کسی اور کے ہاتھوں میں سونپ تو دے پر جب وہ جانے لگتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی میرے قدموں کی بھی۔۔۔۔۔ جانے مجھے کس چیز کی آس تھی، کون سی تمنا میرے دل کو اس وقت چیر رہی تھی، کاٹ رہی تھی۔ میری نظریں مستقل اندر بیٹھی سر جھکائے، کانپتی ہوئی ایمان پر تھیں۔۔۔۔۔ پلیٹ فارم کا آخری کنارہ قریب آتا جا رہا تھا۔ جانے میرے قدم راستے میں پڑی چیزوں اور سامان سے کتنی ٹھوکریں کھا چکے تھے، لیکن تب بھی میں لڑکھڑاتے ہوئے زخمی قدموں سے ٹرین کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ شاید غفور نے کچھ چلا کر کہا تھا۔ شاید کچھ قلی میری طرف بڑھے بھی تھے تاکہ مجھے روک سکیں تاکہ میں پلیٹ فارم کے سرے سے گر کر ٹرین کے نیچے ہی نہ آ جاؤں۔ پر مجھے اس لمحے ہوش ہی کہاں تھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ایمان میری نظروں سے اوجھل ہوئی تو پھر شاید میں اُسے دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ میں نظریں اندر ڈبے میں گاڑھے ہی آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے قدرت کو میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ میری بے چارگی میری لا چاری نے عرش پر جتنے ماتھے ٹیکے تھے، شاید آسمان پر وہ سارے سجدے قبول ہو گئے تھے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور باہر مجھ پر نظر ڈالی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی ایک نظر میں جانے کتنے سوال، کتنی التجائیں اور کتنی بے بسی تھی۔ دوسرے لمحے ہی ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ مجھے جانے کس کے بازوؤں نے تھام لیا۔ میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا۔ بس ٹرین کے تیز پہیوں کی گڑ گڑاہٹ میری سماعتوں کو چیر رہی تھی۔ آنسوؤں سے میرا چہرہ دھل رہا تھا۔ میں وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا دور جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا۔

آ گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ شاید ہم دونوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ دفعتاً عبداللہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس کی بھیگی پلکیں محسوس کرتے ہی میں نے تڑپ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور اُسے کندھے پر تھپکی دی۔ کبھی واقعی لفظ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں دوسرا سہارا آنکھیں ہوتی ہیں جو ہمارے جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتی ہیں۔ پر اگر اس لمحے آنکھیں بھی چھلک رہی ہوں تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو کبھی ہاتھ پکڑ کر، کبھی کمر سہلا کر، کبھی تھپکی دے کر اور کبھی دوسرے کو گلے لگا کر اُسے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے حال میں شریک ہیں۔ میں بھی اس وقت عبداللہ تک بس یہی ہاتھوں کی بولی ہی پہنچا سکا۔ میں نے اس لمحے محسوس کیا کہ حیا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں جنہیں اس نے فوراً برقعے کا پلو گرا کر چھپا لیا۔ حیا اور ایمان کھڑکی کے قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے جاتے جاتے بتایا کہ وہ لوگ بھی ”مجھ“ ہی جا رہے ہیں۔ جہاں مولوی صاحب کی بہن رہتی تھیں، شاید کسی تقریب کے سلسلے میں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری ایمان سے ان دو تین ٹوٹی پھوٹی ملاقاتوں کے علاوہ آج تک کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا لیکن پتہ نہیں اس کے کون سے باہر جانے کی خبر سن کر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی ہمیشہ کے لیے سنان ہونے والا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ ٹرین مجھ سے میرا دل، میرا سب کچھ چھین کر لے جانے والی ہے۔ ایک دم ہی سے جانے کتنی بے چیدیاں میرے رگ دپے میں تیرنے سی لگی تھیں۔ ٹرین دوبارہ دے چکی تھی، عبداللہ نے مجھے گلے لگایا اور پلٹ کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے بوگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میری نظر بے اختیار ڈبے میں بیٹھی ایمان کی طرف اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے جیسے یہ ٹرین، یہ پلیٹ فارم، یہ آس پاس کے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے لوگ، یہ شور، یہ زمین، یہ آسمان۔۔۔۔۔ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایمان اور اس کی دو آنکھیں اس کائنات میں باقی رہ گئیں۔۔۔۔۔ لیکن میری اس بدحواسی کی صرف اتنی ہی وجہ نہیں تھی۔ ایمان میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، جی ہاں۔۔۔۔۔ میری طرف۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے مجھ پر کوئی دوسری نظر ڈالی تھی۔ دوسری نظر، اور وہ بھی اپنی مرضی سے، جیسے ہی میری اس سے نظر ملی۔ اک ٹائپے کو اس کی آنکھوں میں نمی کی

اور ہم دونوں کے چہروں کو سنہری اُجالے سے روشن کرتی رہی۔

نہ جانے کیوں اس دن کے بعد سے میں جب بھی اسٹیشن کے کسی بھی حصے یا پلیٹ فارم سے گزرتا تو آس پاس کام کرتے میرے ساتھی، اسٹیشن کا عملہ، میرے افسر بھی رک کر مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احترام در آتا تھا۔ جیسے مجھے اس عشق کی ایک واردات نے ان سب کی نظروں میں بہت محترم کر دیا ہو۔ حالانکہ میں خود اپنی اس دن کی بے خودی پر بے حد شرمندہ تھا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر مشکل کس قدر شرمندگی ہوئی تھی یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

میں لگا تار روزانہ کراچی سے آنے والی ایکسپریس اور دیگر گاڑیاں ضرور چیک کرتا تھا کہ شاید ایمان واپس آگئی ہو۔ لیکن ہر روز مجھے مایوسی ہی ہوتی تھی۔ دو دن گزر گئے پھر تین پھر چار۔۔۔۔۔

میری فجر اور عشاء کی ”منت“ والی نمازوں میں بھی بے قاعدگی ہونے لگی تھی۔ بس ہر لمحہ ذہن و دل پر وہ دوا آنکھیں ہی سوار رہتی تھیں۔ مجھے ہر وقت بخار سارہنے لگا تھا۔ غفور ایک بار اصرار کر کے کسی ڈاکٹر کو کہیں سے پکڑ لایا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بیماری پوچھی تو غفور نے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”عشق کا بخار ہے ڈاکٹر صاحب۔“

اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی ہنس پڑا۔ واقعی شاید یہ محبت کا ہی بخار تھا۔ یہ جذبے بھی کس قدر طاقت ور ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر گھس کر، خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر ہماری نسوں سے، ہماری رگوں سے چھیڑ چھاڑ تک کر سکتے ہیں۔ ہمارے پورے جسم کا نظام بگاڑ سکتے ہیں، الٹ پلٹ کر سکتے ہیں۔ اب بھلا ایسی کسی بیماری کو وہ بے چارہ ڈاکٹر کیا پکڑ پاتا۔

اس رات بھی مجھے شدید بخار تھا، لیکن میں نے خیر کو تانگہ لگانے کا کہا اُس نے میری طبیعت کے پیش نظر کچھ لیت و لعل سے کام لیا تو میں دوسرے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ مجبوراً خیر کو ہی اپنا تانگہ آگے بڑھانا پڑا۔ میں مسجد کے قریب پہنچ کر اتر گیا۔ راستے میں خیر و نے اپنی بڑی سی پشادری شال مجھے زبردستی اوڑھادی تھی۔ میں اندر جا کر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مولوی علیم حسب معمول اپنے وقت پر پہنچے اور نماز پڑھوائی۔ نماز کے بعد

میرے آس پاس میرے ساتھی قلی، غفور، صدیقی صاحب اور جانے کون کون مجھے تسلی دینے کے لیے تھپک رہا تھا۔ سہلا رہا تھا، اپنے ساتھ بھیج رہا تھا، گلے لگا رہا تھا لیکن مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ دنیا میرے لیے فنا ہو چکی تھی۔

جانے ایمان کی نظر میں کیا تھا؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ شاید یہی کہ میں یہ پاگل پن اور یہ دیوانگی چھوڑ دوں، کہیں نہ کہیں تو میرے سینے کی یہ آگ اور میرے سینے سے اٹھتا یہ دھواں اس کا اُجلادامن بھی تو میلا کر رہا تھا۔ ہاں شاید یہی بات تھی۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ بے بسی کیسی تھی۔۔۔۔۔؟ یہ سوال کیسے تھے۔۔۔۔۔؟ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس پٹری پر چلتا جاؤں، چلتا جاؤں۔۔۔۔۔ وہاں تک، جہاں وہ ٹرین ایمان کو لے کر گئی تھی۔ اُسے جا کر اس انجانے قصبے میں سے کہیں ڈھونڈ نکالوں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میں اس نازنین سے پوچھوں کہ اُس کی آنکھوں میں وہ کیا سوال تھا؟ وہ ایک بار پوچھ کر تو دیکھتی۔۔۔۔۔ میں اپنی روح کا آخری دھاگا کھینچ کر بھی اس کے سوال کا جواب ڈھونڈ ہی لاتا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اسٹیشن دھیرے دھیرے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جلانے جانے والے لکڑی کے پھٹوں اور دیگر بے کار اشیاء کے جلتے الاؤ کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ آگ میں لکڑی کے تختے چنچ رہے تھے۔ غفور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”بابو۔۔۔۔۔ تیرے اندر تو بڑی آگ ہے۔۔۔۔۔ سب ہی کچھ اندر رکھے گا تو اندر ہی اندر جھلس جائے گا۔ ارے غفور تو سمجھتا تھا کہ آج تک صرف اُسی نے عشق کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اپنے کو تو عشق کے عین کا بھی نہیں پتہ۔۔۔۔۔ کہاں سے لایا ہے اتنا لاوا۔۔۔۔۔ اتنی نار۔۔۔۔۔ ایک جھلک نے ہی سارا اسٹیشن جلا کر رکھ کر دیا۔ ایسے نہ کر بابو۔۔۔۔۔ ہم غریبوں پر کچھ رحم کھا۔۔۔۔۔ بتا دے تو کون ہے؟۔۔۔۔۔ کیوں ہم گناہ گاروں سے اور گناہ کروار ہا ہے۔۔۔۔۔ تو تو کسی سلطنت کا شہزادہ ہے، ان مزدوروں میں کیا کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

میرے پاس غفور نے کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا بتاتا میں اُسے؟ میں کچھ نہ بولا بس اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی بولی نے اُسے جانے کیا پیغام دیا کہ پھر اس نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس چپ چاپ بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ جلتی آگ چنچتی رہی

لڑکے میں کن شرعی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

کچھ دیر کے لیے مولوی صاحب چپ سے رہ گئے۔ لیکن باقی نمازیوں کی وجہ سے انہیں جواب دینا ہی پڑا تھا۔

”تمام شرعی باتوں کا، مذہب، کلمہ، نماز، روزہ، حسب نسب سبھی کچھ۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مولوی صاحب کہ رشتہ مانگتے وقت کوئی اتنا ہی مذہبی ہونے

کا ڈھونگ کر رہا ہو جتنا لڑکی کے گھر والے اس سے توقع کرتے ہوں۔“

”ایسی صورت میں یہ دھوکا ہوگا۔۔۔۔۔ اور دھوکے کا عذاب اس شخص کو بھگتنا ہوگا۔“

”میں پانچ وقت کا نمازی ہوں مولوی صاحب۔۔۔۔۔ چھ کلمے بھی مجھے یاد ہیں اور

مذہب جو شرائط لگاتا ہے کسی مسلمان لڑکی سے شادی کے لیے میں ان سب پر پورا اترتا

ہوں۔ دُعا کریں کہ میں جس گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو جائے۔“

میری بات سن کر آس پاس بیٹھے نمازی زیر لب مسکرا دیے۔ مولوی صاحب نے بادل

نواستہ ہی سہی، پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ دُعا ختم ہوئی اور لوگ اٹھ کر وہاں سے چل

ا دیے۔ میں اور مولوی صاحب پیچھے تنہا رہ گئے، انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم یہ سب کچھ بس دکھاوے کے طور پر کر رہے ہو، تمہارا اصل مقصد

ہمکھ اور ہے اور آخر کار آج تمہارے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔“

”آپ کون ہوتے ہیں کسی کی عبادت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے والے۔ یہ تو

اندھے کا اپنے خدا کے ساتھ براہ راست معاملہ ہوتا ہے۔ آپ یا میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ

دکھاوا ہے؟ اور آپ کو تو دوسروں کے دکھاوے کو بھی سچ مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی

ہا ہے۔ کون جانے یہی دکھاوا کسی کو کسی دن سیدھی اور سچی راہ پر لا کھڑا کر دے۔“

مولوی صاحب کچھ لا جواب سے ہو گئے۔ انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

”تم چاہتے کیا ہو، آخر اس طرح سے بار بار میرے سامنے آنے کا تمہارا کیا مقصد

۔“

”آپ میرا مقصد جانتے ہیں، آپ نے اس دن مجھے میری لادینی کا احساس دلایا

حالانکہ اس کم مذہبی میں بھی میرا اپنا سارا قصور نہیں تھا۔ مجھے بچپن کے بعد کسی نے ان

حسب معمول درس اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی نظر لمحہ بھر کو پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے مجھ پر پڑی اور پھر وہ سوال کرنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان نے پوچھا۔

”مولوی صاحب۔۔۔۔۔ یہ بتائیے کہ ہمارے مذہب میں محبت کی شادی کی گنجائش ہے یا نہیں۔“

بے اختیار میری نظر مولوی صاحب کی جانب اٹھ گئی لیکن انہوں نے مجھے دیکھے بنا اس نوجوان کو جواب دیا۔

”محبت شادی کے بعد میاں بیوی میں ہو تو بھی جائز ہے۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی محبت جائز نہیں ہے۔“ نوجوان کی تسلی نہیں ہوئی۔

”لیکن مولوی صاحب ہمارے مذہب میں لڑکی سے سوال کرنے کی گنجائش تو ہے نا۔

میں نے تو سنا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کی بھی

اجازت دی گئی ہے۔ مطلب لڑکی اور لڑکے کی پسندیدگی ضروری ہے۔“

”مولوی صاحب نے سختی سے کہا۔“

”ہاں اگر ضرورت پڑے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے

میں وہی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں جو والدین کی مرضی سے طے پا جائیں۔ اتنا بڑا فیصلہ

ایک کمزور، نا سمجھ اور نا عمر لڑکی پر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ دُنیا کے کوئی ماں باپ جان

بوجھ کر اپنی معصوم بیٹی کو کس غلط شخص کے ساتھ کیوں باندھنا چاہیں گے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ

یہ فیصلہ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔“

مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے جواب دے دیا تھا نوجوان تو شاید مطمئن ہو ہی

گیا ہو لیکن جانے اس ایک پل میں مجھے کیا ہوا۔ میں کئی ہفتوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس

عرصے میں کبھی میں نے مولوی صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اس روز نہ جانے

میں کیوں بول پڑا۔ مولوی صاحب محفل سمیٹ کر اٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ میری آواز سن کر

کبھی چونک کر رُک گئے۔

”مولوی صاحب کسی بھی لڑکی کے لیے اس کے ماں باپ کو رشتہ طے کرتے وقت

گھٹنوں کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور روتے ہوئے انہوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میں چند لمحوں کے لیے تو سُن ہو کر ہی رہ گیا۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔ میں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ مولوی علیم کی اب باقاعدہ رو رو کر ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے مزید گناہ گار اور شرمندہ نہ کریں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں تو۔۔۔۔۔“

ان کی حالت دیکھ کر جیسے میں اپنے لفظ ہی کھو بیٹھا تھا۔ میری بات کاٹ کر بولے۔
 ”تو پھر میری بات مان لو۔ تمہارا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ تمہارے گھر والے اور ہمارا معاشرہ اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ وہ زمین کی خاک ہے، اور تم آسمان ہو۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے کشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے اور وہ جہاں کہیں سے بھی گزرے گی ایک غریب مولوی کی بیٹی ہی کہلائے گی۔ لوگ اس ملن کو عجیب عجیب طرح کے نام دیں گے۔ کل تک وہ الزام صرف تمہارے گھر والوں کی زبان پر تھے، تب ساری دنیا پیٹھ پیچھے یہی باتیں کرے گی۔ میں ایک پیش امام ہوں، لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ سوچو کل جب یہی لوگ میری پیٹھ پیچھے میرے گھر کی عزت اور ناموس پر انگلیاں اٹھائیں گے تو میں کیسے جی پاؤں گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالوں۔“

بس۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے مولوی صاحب کے ہاتھوں کو زور سے دبایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب اب بھی ان کی سفید داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ میں کچھ اس طرح سے مسجد سے نکلا کہ جیسے کوئی جواری جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہو۔ یکا یک آخری بازی بھی ہار دے۔ جانے میں کس طرح تانگے تک پہنچا۔ خیر میری حالت دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”اوائے خانہ خراب۔۔۔۔۔ بابو تیرا بخار تو شدید تیز ہو گیا ہے۔“

باتوں کا احساس ہی نہیں دلایا۔ بہر حال۔۔۔۔۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لیکن اب میں آپ کی مذہب کی لگائی ہوئی شرط پر بھی بہت حد تک پورا اُترتا ہوں۔ اگر کچھ کی رہ گئی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اُسے بھی پورا کر دوں گا۔“

مولوی صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔
 ”میاں تمہاری سمجھ میں جانے یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہمارا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس گھر میں بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“
 ”میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درخواست میں اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔“

مولوی صاحب کی آواز بھرا سی گئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

”کیوں میری برسوں کی کمائی ہوئی عزت کے درپے ہو۔ جب تمہیں اس مسجد میں یا اپنے محلے کے آس پاس بھی دیکھتا ہوں تو ساری ساری رات فکر سے مجھے نیند نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان اگر چل پڑے تو پھر اُسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ میری بچیوں پر اگر کوئی تہمت لگ گئی تو ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔ ہماری غربی پر کچھ رحم کرو۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے اور اس سے بھی چھوٹا ہمارا نڈہ ہے۔ یہاں بات پھیلنے دیر نہیں لگتی۔ پہلے ہی تمہارے گھر کے نوکروں نے اس دن طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی تھیں۔۔۔۔۔ وہ تو بھلا ہوشا کر کا۔ جس نے ان کی زبان وہیں روک دی۔ ورنہ تمہاری ماں اور بھابھی نے مجھے سنی پر لٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ لیکن میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”آپ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ میں کبھی ان جانے میں بھی آپ کی کسی بھی طرح کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہوں۔“

”تو پھر میں تم سے دوبارہ یہی التجا کرتا ہوں کہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

مولوی علیم کی آواز آنسوؤں کی لرزش سے لمحہ بھر کو کانپی اور ایک پل ہی میں وہ میرے

جیوری کا فیصلہ

میں نہیں جانتا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے بلایا یا نہیں، لیکن تین دن کے اندر انکوائری کمیٹی نے اپنا فیصلہ نوٹس بورڈ پر چپکا دیا۔ مجھے اور جم (Jim) دونوں کو ایک ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک سمسٹر کا مطلب چھ مہینے کا تھا۔ البتہ ہمیں موقع دیا گیا تھا کہ ہم اس فیصلے کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ سے اپیل کر سکتے تھے۔ لیکن تین دن کے اندر اس کے بعد ہم یہ حق بھی کھودیتے۔

اس دوران میرا اور جم کا ایک آدھ بار یونیورسٹی کیمپس میں سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ جم جیسے لڑکوں کے لیے چھ مہینے کی معطلی صرف ایک پنک تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طریقے سے مجھے یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ مجھے تو اب یونیورسٹی انتظامیہ بھی اُس کی سازش میں برابر کی شریک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گورے ہر کام بہت سوچ سمجھ کر اور طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کا قانون اس قدر سخت ہے کہ مجھے بغیر کسی انکوائری کے یونیورسٹی سے نکال دینے میں انہیں اس بات کا خدشہ ہوگا کہ میں عدالت کا دروازہ نہ کھٹکھٹا دوں۔ اس لیے انہوں نے پکا انتظام کیا تھا اور اپنی ایمان داری اور انصاف ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے جم کو بھی قربانی دینے پر تیار کر لیا تھا۔

پوری یونیورسٹی میں میرے واحد غمگسار صرف جوزف اور ربیکا تھے۔ ربیکا کے تو آنسو ہی نہیں رک پار ہے تھے۔ میں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ ابھی حتمی فیصلہ ہونا باقی ہے لیکن وہ ربیکا ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

آج یونیورسٹی میں اپیل داخل کروانے کا آخری دن تھا، ورنہ کل سے مجھے یہ کیمپس چھوڑ دینا تھا۔ میں سیدھا ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمیٹی کے چاروں ارکان

خیر و نے جلدی سے مجھے تانگے کی پچھلی سیٹ پر آڑھاتر چھالٹایا اور اُس نے تانگہ بڑک پر ڈال دیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے خود پر نذید غصہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے مولوی صاحب سے اس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آخری اُمید کا بھی خون کر دیا ہے۔

انسان بھی کتنا بے صبر ہے۔ جب تک اُمید کا دامن ہاتھ میں ہو، تب تک وہ اپنے زخم کریدنے سے باز نہیں آتا۔ ہر بار اس اُمید میں زخموں کا کھرند پکنے سے پہلے ہی دوبارہ کھرچ دیتا ہے۔ اور جب زخم اس بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے پک کر ناسور بن جاتا ہے تب وہی نسان بیٹھ کر ساری زندگی خود کو کوستا رہتا ہے۔

اُس وقت مولوی صاحب کی جو حالت ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہوئے وہاں سے میرا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ اس وقت مولوی صاحب کسی بھی قسم کی توجیہ سننے کے قابل نہیں تھے۔ نہوں نے ٹوٹ کر اپنی انا کا خول بھی اپنے آپ ہی پاس پاش کر دیا تھا۔ کاش وہ اس دن بھی اپنے اُسی آپے میں ہی رہتے، مجھے ڈانٹتے، بُرا بھلا کہتے، دھتکار دیتے، دھکے دے کر مسجد سے نکال دیتے، پر وہ نہ کرتے جو انہوں نے کیا تھا۔ اب میں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟ رے لیے تو جیسے ہر ذرہ ہی بند کر دیا تھا انہوں نے۔

جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے سو سے پلتے رہے۔ خالی سنان سڑک پر تانگہ بڑی سے ٹک ٹک کی آوازیں نکالتا اسٹیشن کی جانب رواں تھا۔ سڑک کے کنارے لگی پیلی بجی بیوں کے دائرے روڈ پر وقفے وقفے سے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ذہن بھی ان دائروں کی دشنی کے بیچ میں سڑک کے اندھیرے حصے کی طرح کبھی ڈوب جاتا اور کبھی روشن ہو جاتا۔ نیشن پینچے سے پہلے ہی میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور میرا ذہن مکمل اندھیرے میں دب چکا تھا۔